فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	5
انوار ربانی	دنیا کی زندگی نظر کا دھوکہ	شمیم فاطمہ	7
قول نبیؐ	میں بہت قریب ہوں!	ڈاکٹر عبداللہ محسن	9
خاص مضمون	اسراء و معراج	طلعت ناہید صفدر	13
خفتگانِ خاک	ہمارے بعد بہت روئے ہم کو اہلِ وفا	فرزانہ چیمہ	18
نوائے شوق	زندگی دے دیجیے	ڈاکٹر نزہت اکرام	21
	نعت	اسرار احمد سہاوری (مرحوم)	22
	غزل	نجمہ یاسمین یوسف	22
	غزل	شمیم فاطمہ	23
	غزل	طارق محمود طارق	23
حقیقت و افسانہ	فیصلہ	ڈاکٹر ممتاز عمر	25
	بدلہ	ڈاکٹر شاہد پروین	28
	محبت کی صلیب	ام ایمان	30
معاصر ادب سے انتخاب	بغاوت	شہناز خانم عابدی	35
آپ بیتی	داستان عطاو بخشش	ڈاکٹر ثمین ذکا	38
ہلکا پھلکا	یہ کس کی آواز ہے؟	ربیعہ ندرت	44
	چلتے چلتے	فرزانہ چیمہ	49
مطالعہ گاہ	میری لائبریری سے	قانتہ رابعہ	53
سیرو سیاحت	خواب سے حقیقت تک	آمنہ راحت	59
سارا جہاں ہمارا	عالم اسلام اپنی اصل کی طرف		65
پل صراط پر	گھر ٹوٹنے نہ دینا	خالدہ حبیب	67
	گرمیوں کی چھٹیاں کیسے گزاریں؟	ڈاکٹر فرح کوثر فاروق	69
بتول میگزین	ام عمارہ، رشیدہ صدف، ام مانعہ، شازیہ اویس		71
قدرت کے خزانے	دہی ایک عمدہ غذا	عزہ عثمان	74
حسن و صحت	جلد جواں تو آپ حسیں	شگفتہ فاطمہ	77
گھر داری	کچن کارنر	عزہ، شازیہ مشتاق	79

ابتدا تیرے نام سے

قارئینِ کرام!

اک چراغ اور بجھا!

ماہنامہ بتول کی مدیرہ اور سرپرست، ادارہ بتول کی صدر اور روح رواں، مدیرہ ماہنامہ نور، علم وادب کے اس قافلۂ سخت جاں کے اولین ہمراہیوں میں سے ایک معتبر ہستی محترمہ بنت مجتبیٰ میناؔ اس دنیائے فانی میں ہمارا ساتھ چھوڑ گئیں۔ حق تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے اور ان کی مساعی جمیلہ کو شرفِ قبولیت بخشے آمین۔ میناؔ صاحبہ ایک پائے کی شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ انسانی خوبیوں کا حسین مرقع تھیں۔ علم وعمل میں یکسو، تہذیب وشائستگی میں مثال، تدبّر اور معاملہ فہمی میں یکتا، ادارہ بتول، ماہنامہ بتول اور ماہنامہ نور کی پچپن سالہ تاریخ کے سب ہمسفر ان کی شخصی خوبیوں کے گواہ اور معترف ہیں۔ مرحومہ کے رفیقِ زندگی محترم عبدالسلام مرحوم بھی کئی عرصے تک ان کی معاونت سے ادارہ بتول کے معاملات کے نگران رہے۔ وہ ان بے لوث خواتین کی صفِ اول میں شامل تھیں جنہوں نے افادۂ عام کے لئے ادارہ بتول کے نام سے اشاعتی ٹرسٹ کی بنیا درکھی اور عمر بھر اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا۔

یہاں کسی کو ہمیشہ نہیں رہنا۔ گردشِ مہ وسال عموماً پہلے آنے والوں کو پہلے لے جاتی ہے اور بعد میں آنے والوں میں سے ان کی جگہ لینے والے ابھرتے رہتے ہیں۔ یہ حقیقت جانتے ہوئے بھی ہر بار جب پرانے لوگوں میں سے کوئی اٹھتا ہے تو ہم شدید احساس زیاں اور خالی پن کی کیفیت میں گھر جاتے ہیں۔ سمجھ نہیں آتی کہ ان لوگوں کے بغیر معاملات کیسے چلیں گے۔ کیا وقت کی گردش تھم نہ جائے گی؟ کیا اچھے لوگوں کا وجود دنیا سے ختم نہ ہو جائے گا؟ وہ لوگ جن کے بعد دنیا بے کار سی لگتی ہے اور کاروبارحیات بے وقار سا!

کل من علیھا فان ویبقیٰ وجه ربک ذوالجلال و الاکرام

اگلے شمارے میں بنتِ مجتبیٰ میناؔ صاحبہ کے بارے میں تحریریں شائع کی جائیں گی۔ ان کی شخصیت، خدمات اور شاعری تینوں پہلوؤں سے احاطہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ قارئین میں سے اگر کوئی ان سے کسی ملاقات کی یادداشتیں یا تاثرات لکھنا چاہے یا ان کے کلام پر اظہارِ خیال کرنا چاہے تو ہمیں خوشی ہوگی۔ البتہ تحریر کا 15 جون تک ہمیں موصول ہونا ضروری ہے۔

اوراب ایک نظر اس جلتی اُبلتی گرمی میں جلتے اُبلتے حالات پر......

وہی اک چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے! مہران نیول بیس پر ''دہشت گردوں کے حملے'' نے پوری طرح ثابت کردیا ہے کہ ہم ایک دریا کے پار اترنے کے بعد شدید تر آزمائشوں کے ایک اور دریا میں قدم رکھ چکے ہیں۔ افواجِ پاکستان اور ہماری انٹیلی جنس ایجنسیاں اس امریکی جنگ میں ابتداہی سے شدید تنقید اور سوالات کی زد میں رہی ہیں۔ مگران کے کردار پر اس واقع نے جس قدر شدت سے سوالیہ نشان لگائے ہیں، اس سے پہلے اب تک ایسا نہ ہوا تھا۔ دشمن ایک واقعے سے کئی کام لینا جانتا ہے۔ اس حملے سے جو مبینہ طور پر تحریک طالبان، باالفاظ دیگر را اور سی آئی اے کی کارروائی ہے، ایک جانب پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کو غیر محفوظ ثابت کرنا مطلوب تھا تو دوسری طرف عوام کے ذہنوں میں یہ سوالات اٹھانا کہ جس فوج کے بھاری بجٹ پورے کرنے کے لئے عوام بھوکوں مر رہے ہیں، کیا وہ اپنے اثاثوں کی حفاظت میں اس بُری طرح ناکام ہے؟ یوں عوام کو ان کی اپنی فوج کے خلاف ابھار کر پاکستان کو انتہائی کمزور کردینا مقصود ہے۔ اس صورتحال کو صرف فوج اور آئی ایس آئی سنبھال سکتی ہے کہ وہ سچ عوام کے سامنے رکھے اور اندیشوں کی اس گرد کو صاف کرے۔

اس بار اکانومسٹ کی سرورق کی کہانی بھارت اور پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کے بارے میں ہے جو غالباً اکانومسٹ کے دفتر میں نہیں بلکہ بھارتی سفارت خانے میں بیٹھ کر لکھی گئی ہے۔ جبکہ ایک اور امریکی رسالے نے بھارت اور پاکستان کے درمیان بحر ہند میں سمندری جنگ کا امکان ظاہر کیا ہے۔ ہمارے تجزیہ کاروں کے مطابق پاک نیوی کے دو انتہائی خاص جہازوں کی تباہی اسی پلاننگ کا حصہ ہے۔

وزیر اعظم گیلانی کے دورۂ چین کے موقع پر چین نے پاکستان کی ہر قیمت پر مدد کرنے کا اعلان کیا ہے۔ چین جیسے دوست کی موجودگی میں پاکستان کو امریکہ کے آگے گھٹنے ٹیکنے کی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ مگر افسوس کہ ہمارے لالچی اور خائن حکمران ذاتی تجوریاں بھرنے کے لئے پوری قوم کو امریکہ کے رحم و کرم پر چھوڑ چکے ہیں۔

2 مئی کے فوراً بعد دہشت گردی کی ایک نئی لہر نے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر پاکستان نے اسامہ کو پناہ دے رکھی تھی تو طالبان پاکستان کے خلاف ردعمل کا اظہار کیوں کریں گے؟

اس وقت پاکستان کی سلامتی کو شدید خطرات لاحق ہیں۔ فوج اور آئی ایس آئی شدید شبہات کی زد میں ہیں۔ حکمران حال مست ہیں۔ ''اپوزیشن لیڈر'' میاں نواز شریف اپنے منافقانہ کردار میں منجھ چکے ہیں۔ ملکی معاملات پر ان کی مجرمانہ خاموشی ٹوٹی بھی تو دشمن کے حق میں، کہ انہوں نے بھارت کو دشمن نمبر ایک سمجھنے کی روش کو چھوڑ دینا ترقی کی شرط قرار دیا اور دفاعی بجٹ میں کمی کا مطالبہ کیا۔ اس سے پہلے شہباز شریف کراچی کو الگ صوبہ قرار دینے کی گُل افشانی کر چکے ہیں۔ گویا پنجاب کی ''صدارت'' سنبھالنے کے لئے ان کی تیاری مکمل ہے۔

ان حالات میں امید کی کرن ایک جماعت اسلامی ہے جو بانگ دہل قومی سلامتی کے معاملات پر کرپٹ حکمرانوں اور

بکے ہوئے سیاستدانوں کے خلاف استقامت سے مورچہ زن ہے اور ایک تحریک انصاف ہے جو حکومت کو اس مجرمانہ روش پر للکار رہی ہے۔ ان دونوں قوتوں کا عوام کے اندر بھرپور نفوذ اس بات کا ضامن ہوسکتا ہے کہ باری لگانے والے اقتدار کے بھوکے امریکی مہروں سے قوم کو نجات مل سکے۔ خصوصاً جماعت اسلامی جس کی اپنی ایک مضبوط نظریاتی وفکری بنیاد ہے اور جو پُر عزم سیاسی جدوجہد کی ایک طویل تاریخ رکھتی ہے۔ جماعت اسلامی کے تحت منائی جانے والی حالیہ رابطہ عوام مہم ایک نہایت خوش آئند اقدام ہے جس کے ذریعے حالات کی مایوسی میں امید کی شمع روشن کی جا سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ملک میں خیر کی قوتوں کے ہاتھ مضبوط کرے اور ہمیں اپنا وزن خیر کے پلڑے میں ڈالنے کی توفیق دے۔ آمین

دعا گو

صائمہ اسما

نظر کا دھوکہ

اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا لَعِبٌ وَّلَہۡوٌ وَّزِیۡنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَیۡنَکُمۡ وَتَکَاثُرٌ فِی الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَوۡلَادِ (الحدید ۲۰)

''خوب جان لو کہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری زینت اور آپس میں فخر جتانا اور مال و اولاد میں بڑھنے کی کوشش کرنا ہے۔''

زندگی کے بارے میں لوگ متضاد قسم کا نظریہ اور فلسفہ رکھتے ہیں، کوئی کہتا ہے، ''دو دن کی زندگی ہے ہنس کر گزار لو''، تو کوئی کہتا ہے، ''چار دن کی چاندنی پھر کوفت سے کیا فائدہ!'' کوئی زندگی کی حقیقت کو سرے سے تسلیم ہی کرنا نہیں چاہتا اور کہتا ہے کہ ''زندگی کا ہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا''......اب آپ کے اور میرے کہے سے نہ زندگی خواب بن سکتی ہے نہ سراب...... یہ تو ایک ایسا امتحان ہے، جس کا نتیجہ مسلسل مرتب کیا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو اس طرح آراستہ و پیراستہ کر کے ہمارے سامنے پیش کیا ہے کہ صنم کدۂ کائنات میں کھو جانا نہ کوئی غیر فطری بات ہے، نہ انوکھی، نہ حیران کن!...... کیونکہ جس طرح کسی طلسم کدہ میں قدم رکھتے ہی جادو کا اثر شروع ہو جاتا ہے اور انسان کی عقل کام کرنا چھوڑ دیتی ہے اسی طرح اس خوبصورت دنیا کی بزم آرائی ہمیں مسحور اور بے خود کر دیتی ہے، چنانچہ ہم اس زندگی کو کھیل تماشا سمجھ لیتے ہیں۔

پہلے پہل کھیل کود بچپن سے وابستہ ہوا کرتے تھے۔ بچپن رتے ہی نکتہ چینیاں شروع ہو جایا کرتیں، مثلاً کسی نوعمر لڑکی نے گود میں گڑیا اٹھائی ادھر گھر کا گیا کہ ''اب تک بچپن نہیں گیا''، لڑکوں کو تنبیہ کی جاتی کہ ''میاں اب تم بڑے ہو گئے ہو یہ کھیل کود چھوڑ و''، کوئی پڑھائی میں سنجیدہ نہ ہوتا تو اسے یہ کہہ کر خوف دلایا جاتا کہ ''تم نے امتحان کو کھیل سمجھ رکھا ہے، کچھ پڑھ بھی لو!'' بڑھاپے میں انسان بارہا دل مسوس کر رہ جاتا کہ کاش! ہم بھی کچھ کھیل سکتے! (لیکن اب ہر عمر میں کھیلا جا سکتا ہے۔) آدمی (یعنی انسان) کھیل کا رسیا ہو تو اسے نماز کا ہوش رہتا ہے نہ تسبیح کا۔ اب تو کھیل کی اتنی اقسام ہیں کہ ایک ڈھونڈو ہزار ملتی ہیں۔ غرضیکہ کھیل انسانی زندگی کا حصہ ہے۔

بچپن جونہی رخصت ہوتا ہے، جوانی عمر کی دہلیز پر دستک دینے لگتی ہے۔ دل ہاتھ سے نکلنے لگتا ہے۔ کوئی صورت دل میں سما جاتی ہے۔ کوئی خواب جاگتی آنکھوں میں بس جاتا ہے۔ ہر لمحہ، ہر پل، ہر سوچ، ہر خیال اس کے تصور سے مہکنے لگتا ہے۔ میر کی غزلیں اچھی لگتی ہیں۔ شیریں فرہاد کے قصے بھانے لگتے ہیں۔ لو اسٹوری پڑھنے میں لطف آنے لگتا ہے۔ فلم بینی کی طرف دل کشاں کشاں بڑھنے لگتا ہے۔ پھر بات اس سے آگے بڑھتی ہے۔ ملاقات طے ہوتی ہے۔ باتیں ہوتی ہیں۔ فاصلے گھٹنے لگتے ہیں اور زندگی پوری کی پوری سمٹ سمٹا کر محبت

کے محور پر گھومنے لگتی ہے۔ (برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن، جوانی کی راتیں مرادوں کے دن) یہ عمر ہوتی تو آپ کی ہے لیکن اسے بسر کوئی اور کرتا ہے۔ زندگی کا سب سے بہترین دور، جب صحت، صلاحیت، ہمت، قوت، عزم و حوصلہ اپنے عروج پر ہوتا ہے (یہی عمر تھی جب محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا تھا) مگر کیا یہ کہ دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے کچھ نوجوان خودکشی کر لیتے ہیں۔ اپنا مستقبل تباہ کر لیتے ہیں۔ کوئی بھاگ جاتا ہے کوئی بھگا لے جاتا ہے۔ والدین رسوا ہو جاتے ہیں۔ کبھی یہ نوجوان گھر سے نکال دیئے جاتے ہیں کبھی کالج سے۔ اچھے بھلے ذہین ہونے کے باوجود تعلیمی میدان میں چت ہو جاتے ہیں (سارا دھیان جو دوسری طرف لگا دیتے ہیں) جیب میں ابا کے دیے ہوئے پیسے ہوں تو بات ہی کیا ہے! نہ ہی بھی ہوں تو ادھار لے کر گفٹ دیے جاتے ہیں (لنچ کروانا تو از بس ضروری ہوتا ہے) اپنے نک سک پر بھرپور توجہ دی جاتی ہے کہ کوئی کمی نہ رہ جائے مقابل کے قتل ہونے میں۔ صبح سے شام اور شام سے رات پہلوئے یار اور کوچۂ دلدار میں نہ سہی موبائل پر تو گزرتی ہی ہے (دید کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو گفت و شنید کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، نیٹ میسر نہ ہو تو رات بھر موبائل سے جڑے رہو، لگے رہو! کہاں وہ خوابِ خرگوش کے مزے...... وہ پرسکون نیند...... کہاں یہ دن رات کی بک بک!......)

عمر کا سفر کچھ اور آگے بڑھتا ہے۔ روزی روزگار میسر آتا ہے۔ رشتوں کی ڈھونڈ شروع ہوتی ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ گھر کو آراستہ و پیراستہ کیا جاتا ہے۔ پرانے فرنیچر کباڑیے کو دے دیے جاتے ہیں۔ پرانے پردے تہہ کر کے رکھ دیے جاتے ہیں۔ دیواروں پر نئی پینٹنگ لگا دی جاتی ہے۔ کورنر ٹیبل پر نیا ڈیکوریشن پیس رکھ دیا جاتا ہے۔ پرانی وال کلاک ماسی کو دے دی جاتی ہے۔ پھر بھی دل پر گراوٹ سی رہتی ہے کہ ''بیگم حشمت کا ڈرائنگ روم دیکھا ہے؟؟ واؤ!...... ایک ایک چیز اتنی قیمتی اور نفیس کہ دیکھتے رہ جاؤ!'' ''واقعی! پیسے ہوں تو ذوق بھی اعلیٰ ہو جاتا ہے۔'' پھر اللہ اللہ کر کے (بلکہ بھاؤ تاؤ کر کے) بات طے ہو جاتی ہے۔ بری کی تیاری میں دکھاوے کے لیے دل مچلنے لگتا ہے۔ ہر سوٹ بہترین اور لاجواب ہو۔ دلہن کا میک اپ ٹاپ کلاس کے پارلر میں ہو۔ زیور ٹسوری کا ہو۔ جہیز ایسا ہو کہ لوگوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ جائیں۔ شادی کی تقریب بہترین اور مہنگے ترین ہوٹل یا لان میں ہو؟۔ کھانا! ورائٹی اور کوالٹی دونوں ہونی چاہیے کوئی کسر نہ رہ جائے، کوئی کمی نہ رہ جائے......لوگ برسوں یاد رکھیں کہ ''کیا شادی تھی، کیا کھانا تھا!'' اب جو دکھاوے یا زینت کا سلسلہ یہاں سے شروع ہوتا ہے اسے ساری زندگی برقرار رکھنے کی سعی و جدوجہد جاری رہتی ہے۔ بات بیٹے کے ہنی مون سے شروع ہوتی ہے اور ابا کے چالیسویں تک جا پہنچتی ہے۔ کوئی موقع ایسا نہیں آتا کہ سادگی اختیار کرنے کی نوبت آئے۔ (ہمارا بھی کوئی معیار ہے......کوئی مقام ہے......لوگ کیا کہیں گے؟ اب کیا ہم اپنی غربت کا بورڈ لگا دیں!)

پھر جوانی ادھیڑ عمری کی جانب بڑھتی ہے۔ بنک بیلنس بڑھ جاتا ہے۔ گھر بن جاتا ہے۔ اولادیں بڑی اور برسرِ روزگار ہو جاتی ہیں۔ ایک تفاخر سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اب کیا ہے کہ کہیں

تقریب میں گئے، کسی کی تدفین میں گئے، گیٹ ٹو گیدر کا موقع ہوا، شادی بیاہ، منگنی نکاح، عقیقہ، سالگرہ کی مزاج پرسی ہی کو اگر چلے گئے تو علیک سلیک کے بعد شروع ہو گئے اپنی آسودگی کے قصے سنانے۔

''اللہ کا شکر ہے! بڑے بیٹے کو بڑی اچھی جاب ملی ہے ...... بیٹی کینیڈا چلی گئی ہے۔ پچھلے ماہ منجھلے نے امریکہ بلوایا تھا۔ اس سال بیٹی بہت اصرار کر رہی ہے، کینیڈا جانے کا ارادہ ہے۔ چھوٹا ہائر اسٹڈیز کے لیے آسٹریلیا گیا ہے۔ بہو ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔ ہر شاپنگ پر میرے لیے سوٹ لاتی ہے۔ اگلے ماہ ہم ڈیفنس میں شفٹ ہو جائیں گے۔ ڈرائیونگ سے تھکاوٹ ہو جاتی ہے اس لیے ڈرائیور رکھ لیا ہے، ذرا اسے کولڈ ڈرنک پہنچا دیں......''

الغرض مال و اولاد سے پیدا ہونے والا تفاخر بولنے پر، بتانے پر، جتانے پر اور دکھانے پر اکساتا ہی رہتا ہے۔ اور یوں یہ چار روز کی مہلت جو بطور آزمائش ہمیں مہیا کی گئی ہے (اور اسے بچپن، جوانی، زینت، مال اور اولاد جیسی خود فریبیوں سے آراستہ بھی کیا گیا ہے) دنیا داری میں ہی گزر جاتی ہے۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ یہ دنیا تو نظر کا فریب ہے۔ ایک ایسا تماشہ جس کی رنگینی ہر لمحہ ہمیں اپنی جانب بلاتی ہے۔ ہمارا انہماک جواب دہی کا خوف بھلائے رکھتا ہے۔ الجھائے رکھتا ہے۔ جب ہی اقبالؔ نے مال و دولتِ دنیا اور رشتہ و پیوند کو بتانِ وہم و گماں قرار دیتے ہوئے لا اِلٰہ الا اللہ کی تاکید کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے خبردار کیا ہے کہ

لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ

''تمھارے مال اور تمھاری اولادیں تمھیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کریں۔'' (المنافقون ۹)

۞۞۞

میں بہت قریب ہوں!

ہر رنج اور تکلیف کے موقع پر دعا مومن کا بنیادی سہارا ہے

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''جب میرے بندے میرے بارے میں تجھ سے سوال کریں تو کہہ دے کہ میں بہت ہی قریب ہوں ۔ ہر پکارنے والے کی پکار کو جب وہ مجھے پکارے میں قبول کرتا ہوں ۔ پس لوگوں کو بھی چاہیئے کہ وہ میری بات مان لیا کریں اور مجھ پر ایمان رکھیں ۔(البقرہ۱۸۶)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا:''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرا بندہ میرے ساتھ جیسا عقیدہ رکھتا ہے میں بھی اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرتا ہوں ۔ جب بھی وہ مجھ سے دعا مانگتا ہے میں اس کے قریب ہی ہوتا ہوں (مسند احمد)

حضرت سلمان فارسیؓ فرماتے ہیں نبی کریم نے فرمایا:''بندہ جب اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ بلند کر کے دعا مانگتا ہے تو وہ ارحم الرحمین اس کے ہاتھوں کو خالی پھیرتے ہوئے شرماتا ہے ۔(مسند احمد)

حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ سے ایسی دعا کرتا ہے جس میں نہ گناہ ہو نہ رشتے ناتے ٹوٹتے ہوں تو اللہ تعالیٰ اسے تین چیزوں میں سے ایک ضرور عطا کرتا ہے یا تو اس کی دعا اسی وقت قبول فرما کر اس کی منہ مانگی مراد پوری کر دیتا ہے یا اسے ذخیرہ کر دیتا ہے اور اس کا اجر آخرت میں عطا کرتا ہے یا اس کی وجہ سے کوئی آنے والی بلا اور مصیبت کو ٹال دیتا ہے ۔لوگوں نے یہ سن کر کہا کہ حضور اکرمؐ پھر تو ہم بکثرت دعا مانگا کریں گے ۔ آپؐ نے فرمایا:''اللہ کے ہاں (دینے کے لئے) اس سے بھی زیادہ ہے''۔(رواہ احمدؒ)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''میرا بندہ جب مجھے یاد کرتا ہے اور اس کے ہونٹ میرے ذکر میں ہلتے ہیں میں اس کے قریب ہوتا ہوں۔''(مسند احمد)

بیماری کے دوران بالخصوص اللہ تعالیٰ ہماری بات سننے کے لئے متوجہ ہوتے ہیں اور فرشتے منتظر ہوتے ہیں کہ بیمار انسان اللہ کا نام لے رہا ہو اور وہ اس کی دعا رب کریم تک پہنچائیں اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بیماری کا وقت ایک بڑی نعمت ہے ۔مشہور قول ہے کہ تقدیر تدبیر سے نہیں دعا سے تبدیل ہوتی ہے ۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا نمونہ

جسمانی آلام کے سلسلہ میں اللہ رب العزت نے حضرت ایوب علیہ السلام کے صبر کو نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے ۔جب آپ علیہ السلام ایک شدید اذیت اور جسمانی تکلیف میں مبتلا ہوئے تو دیگر آزمائشوں کی طرح اس تکلیف وہ

آزمائش نے بھی آپ کو صابر و شاکر پایا درد و الم کی انتہا اور تکلیف میں شکوہ و شکایت یا اظہار رنج و غم اور واویلا کی بجائے پکارا تو اپنے رب کریم کی رحمت کو ! ذرا دیکھئے پکارنے کا کیا انوکھا انداز ہے۔

وَ اَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّہٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (الانبیاء ۸۳)

''اور ایوب علیہ السلام (کا تذکرہ) جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے یہ تکلیف پہنچ رہی ہے اور آپ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں۔''

پکار کا یہ والہانہ انداز ہو تو وہ جو سب مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے پکارنے والے پر کیوں نہ مہربان ہوگا اور وہ جو سب سے بڑھ کر پذیرائی بخشنے والا ہے اپنے بندے کے عجز و محبت کے اس بے مثال انداز کو کیوں نہ پذیرائی بخشے گا۔ اس نعم العبد کی یہ پکار قبول ہوئی اور نہ صرف اس تکلیف سے نجات ملی بلکہ صبر کا یہ انداز ہمیشہ کے لئے مثال قرار پایا۔ اس سمیع و علیم نے صبر و بندگی کے والہانہ انداز کو ہمیشہ کے لئے اپنی کتاب میں ثبت کر دیا۔ حضرت ایوب علیہ السلام کی خوش نصیبی کا کیا کہنا جن کے بارے میں اس کے رب کا فیصلہ ہو۔

''بے شک ان کو صابر پایا بہترین بندہ (اپنے رب کی طرف) بہت رجوع کرنے والا۔'' (ص ۴۴)

یہ تو ایک نبی کا نمونہ تھا بہترین بندہ کا بہترین نمونہ! اب ذرا نبی اکرمؐ کی صحبت اور تربیت پانے والے جلیل القدر ساتھیوں کا حال تو دیکھئے۔

اللہ کی تعریف

حضرت شداد بن اوسؓ اور صنابحی کہتے ہیں کہ ہم دونوں ایک مریض کی عیادت کو گئے اور اس سے کہا تو نے کیوں کر صبح کی؟ اس نے کہا خدا کا شکر ہے میں نے نعمت الٰہی پر صبح کی۔

انہوں نے کہا خوش ہو جاؤ خطاؤں کے دور ہونے اور خطاؤں کے معاف ہونے سے، اس لئے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے یہ سنا ہے کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میں اپنے بندوں میں سے کسی کو بیماری میں مبتلا کرتا ہوں اور وہ اس ابتلاء پر میری تعریف کرتا ہے تو وہ اپنے بستر علالت سے ایسا پاک وصاف اٹھتا ہے جیسا کہ اس کی ماں نے اُسے آج ہی جنا ہے، اور کوئی گناہ اس کا باقی نہیں رہتا اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے میں نے اپنے بندے کو قید کیا اور مصیبت میں ڈالا اور اس کا امتحان کیا، پس اے فرشتو! اس کے نامۂ اعمال میں وہ عمل لکھو جو اس کی صحت کی حالت میں لکھتے تھے یعنی اعمال صالحہ۔ (احمد)

دعائے شفا کی شرائط

قرآن پاک سے بڑھ کر کوئی شے نفع اور شفا دینے والی نہیں۔ نبی اکرمؐ کا جسموں کا علاج فرمانا تین قسم کا تھا۔ ایک طبعی دواؤں سے جو نباتاتی اور حیوانی اجزاء سے تیار کی جاتی ہیں۔ دوسرا مسنون دعاؤں سے جو کچھ دعائیں، اذکار اور آیات قرآنیہ سے ماخوذ ہیں۔ تیسرا ان دونوں قسموں سے مرکب ہے۔ یعنی دواؤں سے بھی دعاؤں سے بھی۔ علماء کرام نے تین شرطوں کے جمع ہونے کے وقت دعائے شفا کے جائز ہونے پر اجماع کیا ہے۔

پہلی شرط یہ کہ وہ دعا کلام اللہ اور اس کے اسماء و صفات کے ساتھ ہو۔ دوسری خواہ عربی زبان میں ہو یا کسی اور زبان میں، مگر یہ کہ ان کے معنی جانے جاتے ہوں۔ تیسری شرط یہ کہ اس اعتقاد کے ساتھ ہو کہ موثر حقیقی حق تبارک وتعالیٰ ہی ہیں۔ اس دعا کی تاثیر (بلکہ دوا کی تاثیر بھی) ان کی مشیّت وتقدیر پر موقوف ہے۔

تعویذ کی سند بھی احادیث سے ملتی ہے۔ ابن مسعودؓ ان بچوں کو جو عقل رکھتے تھے ان کو دعائیں تعلیم فرماتے۔ مگر وہ بچے جو عقل و سمجھ نہیں رکھتے تھے انہیں کاغذ کے ٹکڑے پر لکھ کر گردن میں لٹکاتے تھے۔ چنانچہ علماء آیات قرآنی اور مسنون دعاؤں کا بطور تعویذ گردن میں لٹکانا جائز رکھتے ہیں۔ احادیث میں بیماریوں سے شفا کیلئے بکثرت دعائیں منقول ہیں۔

فاتحۃ الکتاب (سورۃ فاتحہ) کو ہر مرض کی دوا قرار دیا گیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ قرآن کو بہترین علاج فرماتے۔ اکثر امراض میں حضور اکرمؐ سے معوذتین (قرآن پاک کی آخری دو سورتوں) کا پڑھنا منقول ہے۔ آیت الکرسی اور سورۃ بقرہ کی آخری آیات کو مولیٰ کریم کی فریادرسی کا ذریعہ بتایا گیا۔ (اسوہ رسول اکرمؐ از ڈاکٹر عبدالحئیؒ)

دعا کے آداب

۱) یقین کامل:

دعا پورے یقین کامل سے مانگی جائے کہ جس سے مانگا جارہا ہے وہ نہ صرف ہر بات سنتا اور سمجھتا ہے بلکہ جو کچھ مانگا جارہا ہے وہ عطا کرنے کی پوری پوری قدرت اور طاقت رکھتا ہے اور مانگنے پر عطا بھی کرتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا جب اللہ سے مانگو اور دعا کرو تو اس یقین کے ساتھ کرو کہ وہ ضرور قبول کرے گا اور عطا فرمائے گا اور جان لو اور یاد رکھو کہ اللہ اس کی دعا کو قبول نہیں کرتا جس کا دل (دعا کے وقت) اللہ سے غافل اور بے پرواہ ہو۔ (جامع ترمذی)

۲)۔ رزق حلال:

دوسری اہم بات یہ ہے کہ دعا مانگنے والا حرام رزق کھانے اور پینے سے بچا ہوا ہو۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

''لوگو! اللہ تعالیٰ پاک ہے، وہ صرف پاک ہی کو قبول کرتا ہے۔ اس نے اس بارے میں جو حکم اپنے پیغمبروں کو دیا ہے وہی اپنے سب مومن بندوں کو دیا ہے۔ پیغمبروں کے لئے اس کا ارشاد ہے:

''اے رسولو! تم کھاؤ پاک اور حلال غذا اور عمل صالح کرو۔ میں خوب جانتا ہوں تمہارے اعمال کو۔''

اہل ایمانکو اللہ تعالیٰ نے مخاطب کر کے فرمایا ہے:

''اے اہل ایمان! تم ہمارے رزق میں سے حلال اور طیب کھاؤ (اور حرام سے بچو)۔''

اس کے بعد حضور اکرمؐ نے ذکر فرمایا ایک ایسے آدمی کا جو طویل سفر کر کے (کسی مقدس مقام پر) ایسی حالت میں جاتا ہے کہ اس کے بال پراگندہ ہیں اور جسم اور کپڑوں پر گردوغبار ہے اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کرتا ہے ''اے میرے رب! اے میرے پروردگار!'' اور حالت یہ ہے کہ اس کا کھانا حرام ہے اس کا پینا حرام ہے اس کا لباس بھی حرام ہے اور حرام غذا سے اس کی نشوونما ہوئی تو اس آدمی کی دعا کیسے قبول ہوگی؟'' (صحیح مسلم)

رحمتہ للعالمین ﷺ نے فرمایا:

''دعا کارآمد اور نفع مند ہوتی ہے ان حوادث میں بھی جو نازل ہو چکے ہیں اور ان میں بھی جو ابھی نازل نہیں ہوئے۔ پس اے خدا کے بندو! دعا کا اہتمام کرو۔'' (جامع ترمذی)

۳)۔ دعا سے پہلے حمد وصلوٰۃ:

فضالہ بن عبیدؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا ''جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو (دعا کرنے سے پہلے) اس کو چاہئے کہ اللہ کی حمد وثناء کرے، پھر اس کے رسول اکرمؐ پر درود بھیجے۔ اس کے بعد جو چاہے اللہ سے مانگے۔'' (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

بعض روایتوں میں دعا کے آخر میں آمین کہنے اور درود شریف پڑھنے کی فضیلت کا ذکر آیا ہے۔ اس کا اہتمام بھی ضرور کرنا چاہئے۔ ☆☆

اخذ وترتیب: طلعت ناہید صفدر

اسراء ومعراج

تاریخِ انسانی کے بڑے واقعات میں سے ایک ایسا واقعہ جس نے زمانے کی رفتار کو بدل ڈالا اور آنے والے وقت پر اپنے مستقل اثرات چھوڑے

یہ واقعہ اُس مرحلے میں پیش آیا جب آپؐ کو توحید کی آواز بلند کرتے ہوئے تقریباً بارہ برس گزر چکے تھے۔ آپؐ کے مخالفین آپؐ کا راستہ روکنے کے سارے جتن کر چکے تھے مگر ان مخالفتوں کے باوجود آپؐ کی آوازِ توحید عرب کے گوشے گوشے تک پہنچ چکی تھی عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جس میں دو چار آدمی آپؐ کی دعوت سے متاثر نہ ہو چکے ہوں۔ مکہ میں بھی مختصر لوگوں کا ایک جھتا تیار ہو چکا تھا جو اس دعوت کی کامیابی کے لئے ہر خطرہ قبول کرنے کو تیار تھا۔ مدینہ میں بھی اوس اور خزرج کے طاقتور قبیلوں کی بڑی تعداد آپؐ کی حامی بن چکی تھی۔ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ وقت آنے والا تھا کہ آپؐ کو مکہ سے مدینہ کی طرف منتقل ہونے اور منتشر مسلمانوں کو ایک جگہ سمیٹ کر اسلام کے اصولوں کے مطابق ایک ریاست قائم کرنے کا موقع ملنے والا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی اور واقعہ معراج کا فیصلہ ہوگیا۔ یہ واقعہ حضورؐ پاک کی سیرت پر ایک مرصع تاج کی طرح ہے ایسا تاج جس سے انبیاءِ اکرام سمیت تاریخِ انسانی کے کسی فرد کی سیرت بھی مزین نہیں ہوئی۔ بے شک یہ واقعہ طائف اور مکہ کے لوگوں سے دیئے ہوئے دکھوں کا مداوا بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی شان کی بلندی کے لئے دنیا کے ساتھ ساتھ آسمانوں کو بھی آپؐ کے لئے مسخر کر دیا۔

واقعہ اسراء اور معراج

یعنی ایک ہی رات آپؐ کو جسم وروح کے ساتھ بحالت بیداری مسجد حرم سے بیت المقدس بھی لے جایا گیا اور اسی رات آپؐ عالم بالا کی انتہائی بلندیوں سے گزرتے ہوئے بارگاہ رب العزت تک پہنچے اور صبح ہونے سے پہلے مکہ واپس تشریف لے آئے۔

دراصل یہ سفر دو حصوں پر مشتمل ہے اسراء اور معراج اسراء کے معنی ہیں رات کی تاریکی میں سیر اور معراج کا مطلب بلندی کی طرف لیجانا یہ لفظ عروج سے نکلا ہے۔ سفر کا پہلا حصہ اسراء یعنی مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ (سورہ بنی اسرائیل۔۱) کی طرف مگر معراج یعنی دوسرے حصے کے متعلق جو تفصیلات ہیں وہ ہمیں تقریباً پچیس سے پنتالیس احادیث میں ملتی ہیں جسے بکثرت صحابہ اکرامؓ نے بیان کیا ہے۔ ان میں مفصل ترین روایات حضرت انس بن مالکؓ، حضرت ابو ہریرہؓ حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت اُم ہانیؓ سے مروی ہیں۔ یہ واقعہ پیش کب آیا اس کے بارے میں بھی مختلف اقوال ہیں اکثر صحابہ اس بات پر تو متفق ہیں کہ ہجرت سے ایک سال پہلے اور بعثت کے بارہویں سال ہوا

مگر مہینے کے متعلق سب ایک جگہ متفق نہیں۔ علامہ زرقانی کی رائے یہ ہے کہ جب کسی قول کو دوسرے قول پر ترجیح دینے کیلئے زیادہ دلائل موجود نہ ہوں تو مشہور قول کو ہی اختیار کر لینا چاہیے یہی بہتر ہے'' سو مشہور قول ستائیس رجب 12 ؁ء بعد بعثت ہے (رحمت عالم)۔

حدیث میں جو تفصیلات اس واقعہ کی آئی ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ رات کے وقت جبرائیلؑ آپؐ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک براق پر لے گئے وہاں آپؐ نے انبیاء اکرام کے ساتھ نماز ادا کی پھر وہ آپؐ کو عالم بالا کی طرف لے گئے، وہاں مختلف طبقات سماوی پر جلیل القدر انبیاء سے آپ کی ملاقات ہوئی آخر کار آپؐ انتہائی بلندیوں پر پہنچ گئے اور اپنے رب کے حضورؐ حاضر ہوئے۔ اس حضوری کے موقع پر دوسری اہم ہدایات کے علاوہ آپؐ کو نماز پنجگانہ کی فرضیت کا حکم دیا گیا آپؐ کو جنت و دوزخ کا مشاہدہ کروایا گیا اس کے بعد آپؐ بیت المقدس کی طرف پلٹے اور وہاں سے مسجد حرام واپس تشریف لے آئے۔ اصل بات جو واقعہ معراج کے سلسلے میں سمجھ لینی چاہیے وہ یہ کہ انبیاء کرام میں سے ہر ایک کو ان کے منصب کی مناسبت سے زمین اور آسمان کی چیزوں کا مشاہدہ کرایا گیا اور ان کے سامنے وہ حقیقتیں بھی واضح کی گئیں جن پر ایمان بالغیب لانے کی دعوت جب وہ لوگوں کے سامنے پیش کریں تو یہ شہادت دے سکیں کہ یہ حقیقتیں ہماری آنکھوں نے بھی دیکھی ہیں، ہم خود ان باتوں کو جانتے اور مانتے ہیں جو ہم پیش کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان سلطنت میں سے کرہ ارض ایک بہت چھوٹا سا حصہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی کے لئے ہر دور میں ساتھ ساتھ پیغمبر بھی بھیجے تا کہ بنی نوع انسان کو صحیح تہذیب، پاکیزہ اخلاق اور سچے علم وعمل کے اصول بتائے جائیں اور پھر اس پیغمبری جیسے منصب کے لئے وہی لوگ مقرر ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ قابل اعتماد ہوتے ہیں اور جب انہیں اس مقصد کے لئے مقرر کیا جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ خود اُن کو اپنی سلطنت کے اندرونی نظام کا مشاہدہ بھی کراتا ہے اور ان پر کائنات کے وہ اسرار ظاہر ہونے لگتے ہیں جو عام انسانوں پر ظاہر نہیں کیے جاتے ''وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہوں''، اور یہی وجہ ہے کہ انبیاء اکرام اللہ کی راہ میں ایسی ایسی مشکلات جھیل لیتے ہیں جنہیں کوئی جھیل نہیں سکتا۔ مثال کے طور پر

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آسمان وزمین کے ملکوت یعنی اندرونی نظام کا مشاہدہ کروایا گیا (سورہ انعام آیت ۷۵) یہ بھی دکھایا کہ اللہ کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے (بقرہ ۲۶۰) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طُور پر جلوہ ربانی کروایا (الاعراف ۱۴۳) پھر ایک خاص بندے کے ساتھ مدت تک پھرایا تا کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق چلنے والے دنیا کے نظام کا مشاہدہ کیا جائے (الکہف ۶۰ سے ۸۲) اسی طرح آپؐ کے ساتھ بھی کچھ تجربات گزرے جیسے آپؐ اللہ کے مقرب فرشتے کو آسمان پر دیکھتے ہیں (التکویر ۲۳) کبھی وہی فرشتہ آپ سدرۃ المنتہیٰ کی آخری سرحد پر ملتا ہے اور وہاں آپؐ اللہ کی عظیم الشان نشانیاں دیکھتے ہیں (انجم

۱۳تا۱۸)(بنی اسرائیل ۱:۱۷)

محمدﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی بارگاہ خداوندی میں طلب کیا کیونکہ عنقریب تحریک اسلامی ایک اہم موڑ مڑنے والی تھی جس کے جانثار اپنے سپہ سلار کے ساتھ تیار کھڑے تھے اور آپؐ کو اسلام کے اصولوں پر ایک نئی ریاست کا سنگ بنیاد رکھنے سے پہلے وہ ہدایات دی جانی تھیں جن پر نبیؐ اور اصحابؓ نبی کو آگے کام کرنا تھا۔

سفر معراج

رسولؐ اللہ کو پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہوئے تقریباً بارہ سال گزر چکے تھے، باون برس کی عمر تھی حرم کعبہ میں سوئے تھے (بخاری، مسلم، مسند احمد ابن جریر) دوسری روایات میں ہے کہ اسراء کا آغاز حضورؐ کی چچازاد بہن ام ہانی بنت ابوطالب کے گھر سے ہوا جہاں آپؐ عشاء پڑھ کر سوئے تھے (طبرانی، ام ہانی، بیہقی نے حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے کچھ روایات میں حطیم کا مقام اور کچھ میں شعب ابی طالب ہے (دراصل یہ سب مقام حدود حرم ہی میں شامل ہیں) یکا یک جبرائیلؑ فرشتے نے آکر آپؐ کو جگایا نیم خفتہ نیم بیداری کی حالت میں اٹھا کر آپؐ کو آب زم زم کے پاس لے گئے، سینہ چاک کیا، اسی آب سے قلب مبارک کو دھویا پھر اس میں علم، بردباری، دانائی، ایمان و یقین بھر دیا (حضرت عبداللہ بن عباس، بخاری، مسلم میں حضرت ابوذر، مسند احمد میں حضرت ابی بن کعب) اس کے بعد آپؐ کی سواری کے لئے ایک جانور پیش کیا گیا جس کا رنگ سفید اور قد گدھے سے بڑا اور خچر سے کچھ چھوٹا تھا برق کی رفتار سے چلتا تھا اسکا ہر قدم حدِ نظر پر پڑتا تھا اسی مناسبت سے اسکا نام براق تھا (سفید، روشن برق کی طرح تیز) پہلے انبیاء اکرام بھی اسی نوعیت کے سفر میں اسی سواری پر جایا کرتے تھے۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ براق ہی پر حضرت حاجرہؑ اور شیر خوار بچے کو مکہ لے کر گئے تھے۔

جب نبی پاکؐ براق پر سوار ہونے لگے تو وہ چمکا، جبرائیلؑ نے تھپکی دی اور کہا دیکھ کیا کرتا ہے آج تک محمدؐ سے بڑی شخصیت کا کوئی انسان تجھ پر سوار نہیں ہوا اس پر وہ شرمندہ ہوکر پسینے پسینے ہوگیا (ابن حبان، مسند احمد، حاکم، طبرانی) پھر آپؐ اس پر سوار ہوئے اور جبرائیلؑ آپؐ کے ساتھ چلے (سنائی، ابن جرید)

پہلی منزل مدینہ تھی جہاں اتر کر آپؐ نے نماز پڑھائی۔ جبرائیلؑ نے بتایا کہ ہجرت کر کے آپؐ یہاں آئیں گے دوسری منزل طُور سینا کی تھی جہاں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰؑ سے ہمکلام ہوئے۔ تیسری منزل بیت اللحم تھی جہاں حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے چوتھی منزل پر بیت المقدس تھا جہاں پر براق کا سفر ختم ہوگیا (سنائی بروایت انسؓ بن مالک) براق کو اسی مقام پر باندھ دیا گیا جہاں انبیاء اس کو باندھا کرتے تھے۔ (مسند احمد، ابن اسحاق، ابن جرید) ہیکل سلیمانی میں آپؐ جب داخل ہوئے تو سب پیغمبروں کو موجود پایا جو ابتدائے دنیا سے اس وقت تک دنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ آپؐ کے پہنچتے ہی نماز کے لئے صفیں بندھ گئیں۔ سب ہی منتظر تھے کہ امامت کون کروائے گا۔ جبرائیلؑ نے آپؐ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا آپؐ نے سب کو نماز پڑھائی (ابن

جریر، بیہقی، سنائی، طبرانی)

پھر آپؐ کے سامنے تین پیالے رکھے گئے ایک میں پانی دوسرے میں دودھ اور تیسرے میں شراب تھی آپؐ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا اس پر جبرائیلؑ نے آپؐ کو مبارک باد پیش کی کہ آپؐ فطرت کی راہ پا گئے (طبرانی کی روایت حضرت صہیبؓ، ابن جریر کی روایت حضرت انسؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ)۔

اس کے بعد ایک سیڑھی آپؐ کے سامنے پیش کی گئی اور جبرائیلؑ اس کے ذریعے سے آپؐ کو آسمان کی طرف لے گئے (ابن ابی حاتم)

پہلے آسمان پر پہنچے تو دروازہ بند تھا جبرائیلؑ نے دروازہ کھلوایا۔ آپؐ کے لئے دروازہ کھولا گیا اللہ کے حکم سے آپؐ نے وہاں انسانوں کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو دیکھا اور انہیں سلام کیا انہوں نے آپؐ کو مرحبا کہا اور سلام کیا اور آپؐ کی نبوت کا اقرار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ان کے دائیں جانب سعادت مند روحیں اور بائیں جانب بد بخت روحیں دکھلائیں۔

پھر آپؐ کو دوسرے آسمان پر لیجایا گیا اور دروازہ کھلوایا گیا آپؐ نے وہاں حضرت یحییٰ علیہ السلام اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو دیکھا دونوں سے ملاقات کی سلام کیا دونوں نے جواب دیا اور آپؐ کی نبوت کا اقرار کیا۔

تیسرے آسمان پر ایک نہایت ہی خوبصورت بزرگ سے تعارف ہوا جن کا حسن عام انسانوں کے مقابلے میں ایسا تھا جیسے تاروں کے مقابلے میں چودھویں کا چاند ہو، یہ حضرت یوسف علیہ السلام تھے۔

چوتھے پر حضرت ادریسؑ پانچویں پر حضرت ہارونؑ چھٹے پر حضرت موسیٰ آپؐ سے ملے اور آپؐ کی نبوت کا اقرار کیا۔

ساتویں آسمان پر پہنچے تو عظیم الشان محل ''بیت المعمور'' دیکھا جہاں بے شمار فرشتے آتے جاتے دکھائی دیئے، اسی جگہ آپؐ کی ملاقات ایک بزرگ سے ہوئی جو خود آپؐ سے مشابہ تھے تعارف پر معلوم ہوا کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں (مسند احمد، بخاری، مسلم، بروایت مالک بن قعصہ، مسند احمد، مسلم بروایت انس بن مالک)۔

جن جن اصحاب سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی سب نے آپؐ کی نبوت کا اقرار کیا۔

اس کے بعد آپؐ کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس لیجایا گیا۔ پھر آپؐ کے لئے بیت المعمور ظاہر کیا گیا جو پیش بارگاہ رب العزت اور عالم خلق کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتا ہے اس پر تمام خلائق کا علم ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد جو کچھ ہے وہ غائب ہے جس کا علم نہ کسی نبی کو ہے نہ کسی مقرب فرشتے کو سوائے اس کے جس کو اللہ علم دے دے اسی مقام کے قریب آپؐ کو جنت کا مشاہدہ کروایا گیا آپؐ نے دیکھا کہ اللہ رب العالمین نے یہاں اپنے بندوں کو جو کچھ مہیا کر رکھا ہے نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی ذہن میں اس کا تصور گزرا۔ (بروایت عبد اللہ بن مسعود، ابن جریر، ابن حاتم، ابوسعید خدری)۔

سدرۃ المنتہیٰ پر جبرائیل ٹھہر گئے اور آپؐ تنہا آگے

بڑھے ایک بلند ہموار سطح پر پہنچے تو بارگاہ جلال سامنے تھی ہم کلامی کا مشرف بخشا گیا (انس بن مالک) جو باتیں ارشاد کی گئیں چند یہ ہیں۔

۱۔روزانہ پچاس نمازیں

۲۔سورہ البقرہ کی آخری دو آیات

۳۔شرک کے سوا دوسرے سب گناہوں کی بخشش کا امکان ظاہر کیا گیا

۴۔ارشاد ہوا جو نیکی کا ارادہ کرے گا اس کے حق میں ایک نیکی لکھی جائے گی مگر جب وہ کر گزرے گا تو دس نیکیاں لکھی جائیں گی مگر جو برائی کا ارادہ کرتا ہے اس کے خلاف کچھ نہیں لکھا جاتا مگر جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو ایک برائی لکھی جاتی ہے۔

ابتدا میں پچاس نمازوں کے فرض کیے جانے پر سب متفق ہیں۔پیش خداوندی سے واپسی پر آپؐ نچلے آسمان پر آئے تو حضرت موسیٰ سے ملاقات ہوئی انہوں نے روداد سنی اور کہا میں بنی اسرائیل کا تلخ تجربہ رکھتا ہوں میرا اندازہ ہے کہ آپؐ کی اُمت پچاس نمازوں کی پابندی نہ کر سکے گی جایئے اور کمی کے لئے عرض کیجئے۔آپؐ گئے اللہ جل شانہٗ نے دس نمازیں کم کر دیں واپسی حضرت موسیٰؑ نے پھر وہی بات کہی ان کے کہنے پر آپؐ بار بار اوپر جاتے رہے اور ہر بار دس دس نمازیں کم ہوتی گئیں آخر پانچ نمازوں کی فرضیت کا حکم ہوا اور فرمایا گیا یہی پچاس کے برابر ہیں۔

آپؐ نے جنت میں چار نہریں بھی دیکھیں دو باطنی اور دو ظاہری جو کہ نیل و فرات تھیں۔

آپؐ نے اُن لوگوں کو بھی دیکھا جو ظلماً یتیموں کا مال کھاتے تھے ان کے ہونٹ اونٹ کے ہونٹ کے مانند تھے وہ اپنے منہ میں پتھر کے ٹکڑوں جیسے انگارے ٹھونس رہے تھے جو ان کے پاخانے کے راستے نکل رہے تھے۔

آپؐ نے سود خوروں کو بھی دیکھا ان کے پیٹ اتنے بڑے بڑے تھے کہ اپنی جگہ سے ادھر ادھر نہیں ہو سکتے تھے۔

آپؐ نے زنا کاروں کو بھی دیکھا ان کے سامنے تازہ اور فربہ گوشت ہے جس کو چھوڑ کر وہ سڑا ہوا گوشت کھا رہے ہیں۔

آپؐ نے اُن عورتوں کو بھی دیکھا جو اپنے شوہروں پر دوسروں کی اولاد داخل کر دیتی ہیں ان کے سینوں میں بڑے بڑے ٹیڑھے کانٹے چبھو کر انہیں آسمان اور زمین کے درمیان لٹکا دیا گیا ہے۔

آپؐ نے آتے جاتے اہل مکہ کے ایک قافلے کو بھی دیکھا اور ان کا ایک اونٹ بھی بتایا جو براق کے خوف سے بھڑک گیا تھا اور اپنی جگہ سے بھاگ گیا تھا آپؐ نے اس قافلے والوں کا پانی بھی پیا جو ڈھکے ہوئے برتن میں رکھا تھا اُس وقت قافلہ سو رہا تھا آپؐ نے اسی طرح برتن ڈھک کر چھوڑ دیا تھا اور یہ بات معراج کی صبح آپؐ کے دعویٰ کی صداقت کی دلیل ہے(ابن ہشام)

واپسی

واپسی کے سفر میں آپؐ اسی سیڑھی سے اتر کر بیت المقدس میں آئے ، یہاں تمام انبیاء موجود تھے آپؐ نے انہیں نماز پڑھائی یہ غالباً فجر کی نماز تھی پھر ’’براق‘‘ پر سوار

ہوئے اور مکہ پہنچ گئے (البدایہ والنہایہ جلد۳ص ۱۱۲۔۱۱۳)

صبح سب سے پہلے آپؐ نے اپنی چچا زاد بہن ام ہانیؓ کو یہ ساری روداد سنائی پھر باہر نکلنے کا قصد کیا تو انہوں نے آپؐ کی چادر پکڑ لی اور کہا خدا کے لئے یہ واقعہ کسی کو نہ سنایئے گا ورنہ ان کو آپؐ کا مذاق اڑانے کا ایک موقع مل جائے گا مگر آپؐ یہ کہتے ہوئے نکل گئے، میں ضرور بتاؤں گا (مسند احمد، بخاری، ترمذی، جابر بن عبداللہ)

حرم کعبہ پہنچے تو ابوجہل سے آمنا سامنا ہوا اُس نے کہا کوئی نئی خبر! فرمایا ہاں پوچھا کیا؟

آپؐ نے فرمایا آج رات میں بیت المقدس گیا تھا اس نے حیرت اور طنز سے کہا بیت المقدس راتوں رات ہو آئے اور صبح یہاں موجود ہو؟ فرمایا ہاں! اس نے کہا کیا قوم کو جمع کروں، سب کے سامنے یہی بات کہو گے؟ آپؐ نے فرمایا بے شک۔

ابوجہل نے آوازیں دے دے کر لوگوں کو جمع کر لیا اور کہا اب کہو۔ آپؐ نے سب کے سامنے پورا واقعہ بیان کیا۔ لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ کوئی تالی پیٹ رہا تھا اور کوئی ماتھے پر ہاتھ مار رہا تھا۔

آناً فاناً یہ خبر تمام مکہ میں پھیل گئی اور بعض کمزور مسلمان اس کو سن کر اسلام سے پھر گئے (نسائی بروایت ابن عباسؓ، ترمذی، بیہقی بروایات جابر بن عبداللہؓ)

لوگ اس امید پر حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچے کہ یہ محمدؐ کے دستِ راست ہیں اگر یہ پھر جائیں تو تحریک کی جان ہی نکل جائے گی ابوبکرؓ نے یہ قصہ سنا اور کہا کہ اگر محمدؐ نے یہ قصہ بیان کیا ہے تو یقیناً سچ ہی ہوگا اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ میں تو روز سنتا ہوں کہ ان کے پاس آسمان سے پیغام آتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتا ہوں (بیہقی بروایت ابو سلمہ بن عبد الرحمٰنؓ) کہا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو اسی موقع پر ''صدیق'' کا خطاب دیا گیا کیونکہ آپ نے اس واقعہ کی اس وقت تصدیق کی جبکہ لوگوں نے تکذیب کی۔

آپؐ نے بیت المقدس کا نقشہ اس طرح بیان کیا جیسے اللہ تعالیٰ نے آپ کے سامنے لا موجود کیا ہو اور آپؐ دیکھ دیکھ کر کیفیت بیان کر رہے ہوں اب لوگ مزید ثبوت مانگنے لگے حضورؐ نے بتایا کہ جاتے ہوئے فلاح مقام پر فلاں قافلہ تھا جس کے ساتھ یہ سامان تھا قافلے والوں کے اونٹ براق سے بھڑک کے اور ایک اونٹ فلاں وادی میں بھاگ گیا تھا۔ بعد میں آنے والے قافلوں نے اس کی تصدیق کی۔ اس طرح ان کی زبانیں بند تو ہو گئیں مگر دلوں میں سوچتے رہے کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ بلکہ آج بھی بہت سے لوگ اسے روح کا سفر کہتے ہیں جبکہ یہ روح مع الجسد کا سفر تھا جو کہ آپؐ نے بیداری کی حالت میں کیا۔

معراج کی اصل حقیقت

معراج کا یہ واقعہ درحقیقت تاریخ انسانی کے ان بڑے واقعات میں سے ہے جنہوں نے زمانے کی رفتار کو بدل ڈالا اور تاریخ دنیا پر اپنا مستقل اثر چھوڑا۔ اس کی اصل اہمیت و کیفیت معراج میں نہیں بلکہ مقصد اور نتیجہ معراج میں ہے اللہ تعالیٰ کا جو پیغام رسولؐ اللہ نے اس دنیا کو دیا وہ قرآن پاک کی سورہ بنی اسرائیل (۲ سے ۳۹) میں لفظ بہ لفظ محفوظ

ہے۔ یہ گویا اسلام کا منشور ہے جس کے چودہ نکات اور جو اسلامی ریاست کے قیام سے ایک سال پہلے اہل عرب کے سامنے پیش کیا گیا۔

دوسری حقیقت جو اللہ تعالیٰ نے سورہ اسراء میں اسراء کے واقعہ کو صرف ایک آیت میں ذکر کر کے کلام کا رُخ فوراً یہود کی سیاہ کاریوں کی طرف موڑ دیا انہیں آگاہ کیا گیا کہ یہ قرآن اس راہ کی طرف ہدایت دیتا ہے جو سیدھی اور صحیح ہے اور یہ بھی اشارہ فرمایا گیا کہ اب یہود کو نوعِ انسانی کی قیادت سے معزول کر کے ان کے اعمال کی وجہ سے اب یہ منصب رسول محمدؐ عربی کو سونپا جائے گا اور یہ روحانی قیادت ایک اُمت سے دوسری اُمت کو منتقل کر دی جائے گی۔

اسراء و معراج کے بابرکت واقعے اور اس کی تہہ میں پوشیدہ کیسی حکمتیں اور کئی چھپے ہوئے راز تھے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے نبی کریمؐ پر آشکار کیئے۔

(واقعہ معراج، تفہیم القرآن از سید مودودیؒ)

ہمارے بعد بہت روئے ہم کو اہلِ وفا

لیجئے! ابھی آپا جی نیر بانو کی جدائی بلکہ سچ پوچھیئے تو باجی سعیدہ احسن اور آپا جی بنت الاسلام کی بھی جدائی کا غم تازہ تھا کہ اب ہماری مینا آپا بھی چل دیں۔اِنا للہِ وَاِناّ اِلیہِ رَاجِعُون

محترمہ بنتِ مجتبیٰ میناصاحبہ! حلقۂ خواتین جماعت اسلامی پاکستان کی رکن ...... اردو شاعری کا ایک غیر مشہور مگر نہایت معتبر نام غیر مشہور اس لئے کہ اپنی روایتی بے نیازی کے تحت اپنا کلام شائع کروانا تو کجا کبھی اس کی نقل تک بھی اپنے پاس نہ رکھی۔ چنانچہ کئی معتبر پرچوں میں چھپنے کے باوجود...... ماہنامہ ''بتول'' اور ماہنامہ ''نور'' کی کافی عرصہ مدیرہ رہنے کے باوجود ......آج کے لوگ ان کے نام سے شاید اور کام سے تو بالکل ہی واقف نہ ہوں گے لیکن جاننے والے جانتے ہیں ...... انہیں پہچاننے والے پہچانتے ہیں کہ یہ اس مخلص حلقۂ ادب کا ایک جگمگاتا ہوا ستارہ تھا جس نے نامساعد حالات میں خواتین کے لئے چندہ کر کے ماہنامہ بتول کی داغ بیل ڈالی اور پھر اپنے قلب وجگر سے اس کی آبیاری میں جُت گیا۔ مینا آپا نے سوز جگر سے شاعری کی ، جماعت اسلامی میں شبانہ روز کام کیا۔ تین بیٹیوں اور ایک بیٹے اور شریک حیات کے ساتھ گھر گھرہستی کا کردار بھی اس خوبی سے نبھایا کہ سب بچے اس راہ کے خیر خواہ اور کارکن بنے۔ محترمہ مینا آپا کی حیات و خدمات کا مفصل تذکرہ تو ان کے بچے اور بہو کریں گے جبکہ آپا جی زہرہ عبد الوحید، زبیدہ اسعد گیلانی اور آپا جان ثریا اسماء ان کی داستان مہر ووفا بخوبی دہرا سکتی ہیں کہ یہ ان کی سہیلیاں بھی تھیں۔

ہم تو ان لوگوں میں سے ہیں جو ان سے بہت پیچھے رہ کر ...... بہت بعد میں ان کے قافلے میں شامل ہوئے اور ایسے روشن چہرہ لوگوں کو ایک محبت ...... ایک عقیدت سے دیکھتے رہتے۔ الحمد للہ کچھ عرصہ کی رفاقتیں بھی ملیں مگر آج تک انہیں کہہ نہ سکے کہ مینا آپا! آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں'' ...... یہ حجاب ...... یہ سکوت صرف انہی تک محدود نہ تھا میں تو کسی کو بھی نہ بتا سکی نہ آپا جی بنت الاسلام کو ...... نہ باجی سعیدہ کو...... نہ آپا جی نیر بانو کو...... کہ آپ مجھے کس قدر عزیز ہیں......اور اللہ جانتا ہے کہ اس محبت اس عقیدت کی وجہ یہی تو ہے کہ ان تمام ہستیوں کو اللہ، اس کے رسول ﷺ اور اسلام سے محبت تھی۔

19 مئی 2011ء 15 جمادی الثانی 1432ھ جمعرات کی صبح سات بجے کے قریب رومیصا احسن نے فون پر یہ اطلاع دی کہ مینا آپا آج صبح اذان فجر کے وقت فوت ہوگئی ہیں دبئی اپنی بیٹی کے پاس گئی ہوئی تھیں آپ دوسرے لوگوں کو بھی اطلاع کر دیں ''یہ اطلاع کرنا میرے ہی نصیب میں لکھ دیا گیا'' باجی سعیدہ کی اطلاع ......ساجدہ زبیری کی اطلاع ......آپا جی نیر بانو کی اطلاع ! دل کی دنیا تہہ وبالا ہو چکی تھی۔ان کے

بارے میں صحت کی کمزوری ، یادداشت کی کمزوری قسم کی اطلاعات ذروہ احسن سے ملتی رہتی تھیں مگر ملنے کا پروگرام ان کے لاہور آنے تک اٹھا رکھا تھا ۔ ایک آدھ بار شاید لاہور آئیں بھی مگر مجھے خبر نہ ہوسکی یوں ان سے آخری ملاقات کو کئی برس بیت گئے ۔

بہت سارے کئی برس تو ان سے پہلی ملاقات کو بھی بیت گئے ہیں ۔ مجھے یاد ہے جامعہ پنجاب میں جمعیت طالبات کی طرف سے لڑکیوں کے مابین ایک تقریری مقابلہ رکھا گیا تھا۔ اس مقابلے کی ایک جج میں بھی تھی ۔ پروگرام کے اختتام پر مہمانوں کیلئے چائے پانی کا انتظام تھا۔اس دوران ایک نہایت شائستہ خاتون......جنہیں پہلے مہمان خاص کے طور پر سٹیج پر میں دیکھ چکی تھی لیکن ان کا اسم گرامی نہیں جان سکی تھی ایک مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کرنے کو بڑھیں اور شفقت سے میرا نام پوچھا ......''فرزانہ چیمہ'' میں نے گرم جوشی سے ہاتھ تھامتے ہوئے نام بتایا۔

''وہی فرزانہ چیمہ...... جو''بتول'' میں لکھتی ہیں'' اب ان کی مسکراہٹ میں لگاوٹ بھی شامل ہوگئی تھی ۔

''جی بس تھوڑا بہت لکھ لیتی ہوں کبھی کبھار'' میں جھینپ سی گئی ''تو آپ ہماری حریمِ ادب میں آیا کریں نا۔ ہر ماہ کی آخری جمعرات کو ہوتی ہے'' انہوں نے خلوص سے دعوت دی۔

میرے لئے یہ ایک حیرت کے ساتھ مسرت انگیز انکشاف تھا۔

''حریمِ ادب؟ کہاں ہوتی ہے یہ نشست؟''

انہوں نے بتایا کہ اچھرہ میں مولانا کی صاحبزادی اسماء مودودی کے ہاں صبح ساڑھے دس بجے ہوا کرتی ہے آپ اس میں آیا کریں۔

''جی ...... جی انشاءاللہ'' اب میری باری تھی کہ ان سے ان کا اسم گرامی پوچھوں۔

''مجھے بنت مجتبیٰ مینا کہتے ہیں'' یہ تھی اس شفیق ہستی سے پہلی ملاقات چنانچہ اس ماہ کی آخری جمعرات جو غالباً 1986ء کی یاد پڑ رہی ہے ...... آج مئی 2011ء تک ہم ہیں ...... آخری جمعرات ہے اور قلم کتاب کا ساتھ ہے۔ساتھ ہی ساتھ یادوں کی بارات ہے جوش ملیح آبادی والی یادوں کی بارات نہیں...... عالم ہوش کی یادوں کی بارات ...... حسین لوگوں کی حسین یادوں کی بارات۔

مینا آپا ایک زمانے میں اپنے حلقے کی کونسلر بھی رہی ہیں ۔ مجھے یاد ہے باجی سعیدہ احسن کے ہمراہ میں پہلی دفعہ جب نسبت روڈ پر ان کی رہائش گاہ پر گئی تو باہر گیٹ کی ایک طرف مریم نام کی تختی آویزاں تھی ۔ میں حیران کہ ہم نے تو مینا آپا سے ملنا ہے اور سعیدہ باجی اس گھر کی اونچی اونچی سیڑھیاں چڑھے جا رہی ہیں اوپر پہنچے تو ایک دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ مینا آپا استقبال کو موجود تھیں تب مجھے معلوم ہوا کہ ان کا اپنا نام مریم ہے۔

ہاں تو جامعہ پنجاب میں حریمِ ادب کے انعقاد کی خبر جو سنی تو پھر بڑے شوق سے وہاں کی راہ لی ۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حریم ادب کی نشست بیت احسن سمن آباد میں باجی سعیدہ کے ہاں منتقل ہوگئی اور اب تک نہایت عمدگی سے جاری وساری

ہے۔

مینا آپا ہماری لاہور کی حریم ادب کی صدر تھیں، نہایت باقاعدگی سے بروقت تشریف لاتیں۔ ہر تحریر کو توجہ سے سنتیں پھر سب سے باری باری تبصرہ کرنے کو کہتیں۔ اگر کوئی یہ کہہ کر بچنے کی کوشش کرتا کہ سب باتیں تو ہو چکیں۔ یا یہ کہ میں نے بھی یہی کہنا تھا تو مینا آپا مسکراتے ہوئے اصرار کرتیں بھئی وہ تو ان کے خیالات تھے۔ آپ اپنی بات کیجئے کہ آپ کو یہ تحریر کیسی لگی؟ پھر آخر میں نہایت جامع انداز میں اپنی رائے دیتیں.....تقریباً ڈھائی تین سال کے بعد ہماری اس ادبی محفل سے بلکہ دنیا سے ہی آپا جی بنت الاسلام بحکم ربی اٹھ کر چل دیں جن کے ایک طرف باجی عفت قریشی اور دوسری طرف باجی سعیدہ بیٹھا کرتی تھیں......آپا جی کے بعد باجی سعیدہ، شریکِ محفل بھی رہتیں ساتھ ساتھ اٹھ کر ادھر اُدھر کے ایک آدھ کام بھی نبیڑ آتیں۔ پھر باجی سعیدہ بھی چلی گئیں اور اب مینا آپا بھی گویا عالم برزخ میں اپنی دل پسند دوستوں کا ساتھ میسر ہوگا۔

میں نے مینا آپا میں حوصلہ اور ضبط بہت دیکھا، عام طور پر شاعر حضرات کے بارے میں مشہور ہے کہ اپنا کلام سنانے کے بارے میں نہایت بیتاب رہتے ہیں۔ لیکن یہاں ایسا کوئی معاملہ نہ دیکھا، اکثر یوں ہوا کہ تحریریں سناتے سناتے ایک بجنے کے قریب ہو گیا تو باجی سعیدہ فوراً بول پڑتیں چلو سمیہّ اب دعا کریں ایک بجنے والا ہے، اور صدر محفل خاموشی سے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیتیں، چاہے ان کے پرس یا ڈائری کے اندر کیسی ہی اچھی غزل یا نظم پڑی ہوتی۔

ان کی خوبصورت آنکھوں میں ایک سوز سا تھا۔ ایک وقار، تہذیب اور شائستگی پہلی ملاقات میں ہی نمایاں طور پہ محسوس ہوتی......آپا جی حمیدہ بیگم سے خاص محبت تھی جو آخری دم تک قائم رہی......ایک دلچسپ واقعہ یاد آ رہا ہے جو نہ جانے کس نے مجھے سنایا تھا کسی محفل میں سمیہّ مسعود بھی موجود تھیں محفل کے بعد چائے سے تواضع کی گئی سمیہّ مسعود بہن نے بے ساختہ کہا میں چائے نہیں پیتی یہ جہنم کا مشروب ہے۔ مینا آپا فوراً متوجہ ہوئیں کیوں بھئی! جہنم کا مشروب کیسے ہوا۔ اس کے اجزائے ترکیبی سب حلال ہیں دودھ، پانی، چینی، پتی آخر کون سی چیز حرام ہے جو جہنم کی مستحق ٹھہری جائے؟ ویسے آپ کو پسند نہیں تو نہ پیجئے مگر یوں تو نہ کہیے۔

دعوتِ ولیمہ میں اپنے بیٹے کی شادی پر کافی زیورات پہنے ہوئے بہت خوش خوش مہمانوں کا استقبال کر رہی تھیں۔ مجھے ملیں تو ہنستے ہوئے بولیں۔ بھئی ہمارے ہاں رواج ہے کہ بیٹے کی والدہ پورا زیور پہنتی ہے......آپ کچھ لکھ نہ دیجئے گا۔ یوں باجی سعیدہ اور مینا آپا باہم سمدھنیں بن گئیں اور ہماری حریم ادب کچھ اور خوبصورت ہوگئی۔ ان کی بہت خواہش تھی کہ ان کی بہو ذہین، سمجھدار، پڑھی لکھی کتاب قلم سے محبت رکھنے والی ہو، قسم قسم کے کھانے پکانے کی بے شک ماہر نہ ہو۔ یوں ذروہ احسن کی شکل میں انہیں اپنی پسند کے عین مطابق بہو مل گئی جس کی خوبیوں اور دین داری کی وہ آخر وقت تک معترف رہیں۔ اگر بہو کے ساتھ ان کا یہ حسن اخلاق تھا تو پھر اپنی ساس کے ساتھ بھی ان کا حسن سلوک مثالی ہوگا۔

اللہ رب کریم نے انہیں روشن دماغ اور روشن ضمیر عطا کیا تھا۔ ان کے دل و دماغ میں حیرت انگیز توازن محسوس ہوتا تھا۔ کبھی

آپے سے باہر ہوتے نہیں دیکھا، کبھی ناشائستہ گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا۔ بچپن سے صالح فطرت پائی تھی چنانچہ آپا حمیدہ بیگم کے دامن سے وابستہ ہو کر حلقہ خواتین جماعت اسلامی کا ایک قابل قدر فرد ثابت ہوئیں۔ غور و فکر اور اچھے لوگوں اور اچھی کتب کے مطالعہ نے انہیں کندن بنا دیا اور ان کی طبیعت میں ایک خاص قسم کا ضبط پیدا کر دیا تھا ...... حلقۂ خواتین یا ان کے عزیزوں میں سے شاید کوئی بھی یہ نہ کہہ سکے گا کہ فلاں وقت مینا نے میرے ساتھ زیادتی کی تھی۔

سلیقہ شعاری بھی ان کی ایک نمایاں خوبی تھی۔ حریم ادب میں جب بھی آتیں ہنستے مسکراتے ہمارا حال احوال معلوم کرتے اپنا برقع تہہ کرتی جاتیں پھر سلیقے سے صوفہ یا کرسی کی پشت پر رکھ دیتیں۔ میں نے ایک دن کہا آپا جان! میں تو یوں تہہ نہیں کرتی بس کرسی کی پشت پر ویسے ہی رکھ دیتی ہوں۔ دوبارہ پھر پہننا ہوتا ہے۔ شفقت بھرے لہجے میں کہنے لگیں کپڑا تہہ کر کے رکھ دیا جائے تو کمرہ سمٹا سمٹا یا لگتا ہے صاف ستھرا سا...... اب میں بھی برقع یا چادر تہہ کر کے رکھتی ہوں اور انہیں یاد کرتی ہوں۔ اس طرح محض ایک آدھ جملے سے مگر اپنے عمل سے نہ جانے کس کس کی تربیت کر گئی ہوں گی۔

وہ بہت کم لکھتی تھیں مگر بہت اچھا لکھتی تھیں...... اپنا کلام چھپوانے کا شاید خیال کبھی نہ آیا...... اب ان کی بہو کا فرض ہے کہ وہ ان کے منتشر کلام کو یکجا کر کے خوبصورت شکل میں مرتب کریں...... محترمہ سلمٰی یاسمین نجمی اس کام کو کرنا چاہ رہی تھیں مگر مینا آپا اچانک ہی اٹھ کر چل دیں...... بنت مجتبٰی مینا کہ جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔

ے ہمارے بعد بہت روئے ہم کو اہل وفا
کہ اپنے مٹنے سے مہر و وفا کا نام مٹا

❁❁❁

زندگی دے دیجئے

(ڈاکٹر نزہت اکرام)

یا الٰہُ العالمین ہم پر کرم فرمایئے
راستہ بھولے ہیں ہم وہ پھر ہمیں دکھلایئے
ہم نے قرآں کو بھلایا دیں کو رُسوا کردیا
آج ہم نادم ہیں ہم نے آہ کیا کیا کر دیا
بھیک مانگی غیر سے اپنی حمیت بیچ کر
کردیا سودا بہن کا اپنی غیرت بیچ کر
باپ بھائی بک گئے ڈالر کے عوض سستے دام
ہم نے پائی جن سے آزادی بنے ان کے غلام
بے ضمیری ، کج روی ہے زر پرستی عام ہے
مغربی اقوام کی تقلید اپنا کام ہے
جیسے ہم تھے حکمراں ویسے مسلط ہو گئے
یہ چلن اپنا رہا ہم جاگتے ہی سو گئے
آپ کی سنت ہے یہ ،قرآن سے بھی ہے عیاں
حد سے گزری قوم پر ہوں غیر قومیں حکمراں

بٹ گئے فرقوں میں ہم صوبوں میں ہم خطوں میں ہم
قومی وحدت کو ڈبویا کرلیا خود پر ستم
ہم میں ہوتا فہم تو ملکی مسائل دیکھتے
نسل نو کو کام میں لاتے وسائل دیکھتے
ہم تو ذاتی بینک بیلنس کی طرف دیکھا کئے
اپنے پاکستاں کو اپنے ہاتھ سے لوٹا کئے
ہم گنہگارِ وطن ہیں ہو گئے ہیں روسیاہ
اپنی ہی اغلاط سے شانِ وطن کردی تباہ
ہم پہ اب چھائے ہوئے ہیں سب نصاریٰ و یہود
دستِ استبداد ہم پر ، ہر طرح قدغن ، قیود
آج ہم مظلوم ہیں بے آسرا گمراہ ہیں
قہر میں ہیں مبتلا ہم راندۂ درگاہ ہیں
رحم کردیں ہم پہ اب راحم خدائے کائنات
بخش دیجئے سب خطائیں مالکِ موت و حیات

مر رہی ہے قومِ مسلم زندگی دے دیجئے
پھر وہی ذوقِ جہاد و بندگی دے دیجئے

نعت

اُن کا دامن پھول چن چن کر سجاتی رہ گئی
زندگی کی ہر ادا اُن کو لبھاتی رہ گئی

اِک جھلک دیکھی تھی حسنِ جانفزا کی دُور سے
چشمِ نرگس سخت حیرت سے لجاتی رہ گئی

غنچۂ و گل ہر قدم دامن کشی کرتے رہے
بلبل رنگین نوا نغمے سناتی رہ گئی

آبشاروں نے بکھیرے نغمہ ہائے دل فروز
موجِ دریا رقص کرتی گنگناتی رہ گئی

جلوۂ حسنِ ازل بھی ناز پرور بن گیا
بے نیازی کی ادا دامن بچاتی رہ گئی

لذتِ دُنیا رہی اُن کے جلو میں شرمسار
دولتِ دنیا کی نخوت جگمگاتی رہ گئی

بے نیازانہ وہ گزرے اُس ہجومِ شوق سے
حسن کی ہر اِک ادا اُن کو لبھاتی رہ گئی

لغزش پا سے مری رحمت کا دروازہ کھلا
پارسائی اپنی قسمت آزماتی رہ گئی

اُن کی یادوں نے دیا تھا جذبِ دل کو اِک ثبات
ترکِ اُلفت سے جنوں کی بے ثباتی رہ گئی

ہم نے بھی اسرارؔ آنکھیں پھیر لیں دیوانہ وار
زندگی ہر اِک قدم پر مسکراتی رہ گئی

اسرار احمد سہاوری

''ذوقِ عرفاں'' سے انتخاب: محمودہ شروانی

غزل

سرِ شاخِ نشیمن چہچہانا اور ہے اے دل
کسی کُنجِ قفس کو گھر بنانا اور ہے اے دل

ہنسی اہل چمن کی بھی نہایت خوب ہے لیکن
پسِ دیوارِ زنداں مسکرانا اور ہے اے دل

کسی دشمن سے پنجہ آزمائی اور ہوتی ہے
کسی کی دوستی کو آزمانا اور ہے اے دل

تعلق کے ہزاروں رنگ ہیں دنیائے ہستی کے
کسی سے عمر بھر رشتہ نبھانا اور ہے اے دل

بھری محفل میں گانا داد پانا خوب ہوتا ہے
تصور میں کسی کے گنگنانا اور ہے اے دل

نہ بن ناصح کہ رزمِ من و تو کی آزمائش میں
خودی کے ساتھ خود کو ہار جانا اور ہے اے دل

چھپا کاغذ کی ناؤ میں لڑکپن ملنے آتا ہے
شبِ پیری میں ساون رُت کا آنا اور ہے اے دل

نجمہ یاسمین یوسف

غزل

قلم رو رہا ہے ورق غمزدہ ہے
غزل آنسوؤں سے کوئی لکھ رہا ہے

کٹھن ہے بہت رہ گزر زندگی کی
یہاں ہر قدم پر نیا حادثہ ہے

ابھی سے چمن میں سراسیمگی ہے
ابھی تو فقط ایک پتہ گرا ہے

جدھر دیکھتا ہوں بکثرت خدا ہیں
مجھے کوئی انساں نہیں مل رہا ہے

ترا مسئلہ ہے مرا سر جھکانا
مرا مسئلہ میری اپنی اَنا ہے

ہر اک رہ گزر کہکشاں لگ رہی ہے
جدھر دیکھتا ہوں ترا نقشِ پا ہے

ہمیں ناز ہے تیری قسمت پہ طارقؔ
جسے تو نے چاہا تجھے مل گیا ہے

(طارق محمود طارق۔جدہ)

فیصلہ

اگر دو چار واقعات ایسے اور ہو جائیں تو ممکن ہے کہ......ایک انوکھا قصہ

شیخ عبدالمنان زرگر نے مجھے تاکید کی کہ قاضی صاحب آپ شادی لان میں ٹھیک نو بجے پہنچ جایئے۔ میں نے کہا ارے صاحب! آج کل باراتیں وقت پر کہاں آتی ہیں، مجھے بلا وجہ بٹھا کر کیا کیجئے گا۔ شیخ صاحب سنجیدہ ہو کر بولے آپ میری درخواست کو یونہی نہ لیجئے، وقت مقررہ کی پابندی کا اہتمام کیجئے اگر تاخیر ہوئی تو بھی آپ کا نقصان نہیں ہوگا، میں فی گھنٹہ ایک ہزار روپے کے حساب سے ادا کروں گا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ارے صاحب! میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ آپ جرمانہ ادا کرتے پھریں۔ میں تو آج کل کے مزاج کی وجہ سے کہہ رہا تھا، آپ جس وقت کا حکم دیں گے بندہ حاضر ہو جائے گا۔

جمعہ کے روز میں نے اس بات کا خاص اہتمام کیا بر وقت شیخ صاحب یہاں پہنچ جاؤں اور پھر اتنی احتیاط برتی کہ پونے نو بجے ہی شادی لان جا پہنچا۔ جا کر دیکھا تو وہی ڈھاک کے تین پات نکلے۔ بارات کا دُور دُور پتہ نہ تھا۔ ہاں شیخ صاحب کے اہلِ خانہ وعزیز واقارب موجود تھے۔ تقریب کی تمام تیاریاں مکمل تھیں کمی تھی تو صرف بارات کی کہ جیسے ہی دلہا آئے اور نکاح کی رسم ادا ہو۔ قسم قسم کے کھانے تیار ہو رہے تھے، کہیں سے مچھلی کے تلنے کی خوشبو آرہی تھی تو کبھی کبابوں کے دُھویں سے اُٹھنے والی خوشبو بھوک میں اضافہ کرتی۔ طرح طرح کے مشروبات سجے تھے اور کیوں نہ ہوتے شیخ عبدالمنان صاحب، صاحبِ حیثیت متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ارمین ان کی اکلوتی بیٹی تھی تمام ارمان اُسی پر پورے کرنا چاہتے تھے، انہوں نے اپنی بیٹی کو بڑے ناز ونعم سے پالا تھا۔ اگر دنیاوی دستور نہ ہوتا تو وہ ارمین کو اپنے سے کبھی جدا نہ کرتے مگر یہی دستور چلا آتا ہے کہ بادشاہ زادیاں ہوں یا فقیروں کی بیٹیاں، سب ہی پیا گھر جاتی ہیں۔ شیخ صاحب کے پانچ بیٹے تھے۔ سب نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی مگر اپنے خاندانی پیشے سناری کو اپنایا۔ سب کی اپنی اپنی دکانیں تھیں۔ تین کی شادیاں ہو چکی تھیں، دو کنوارے تھے، ارمین سب سے چھوٹی تھی مگر ایک بہتر رشتے کی آمد کے بعد اسے بیاہنے کا فیصلہ دل پر پتھر رکھ کر شیخ صاحب کو کرنا پڑا۔

ارمین خوبصورت تو تھی ہی مگر والدین کی بہترین تربیت نے اُسے اعلیٰ سیرت وکردار کا مالک بھی بنا دیا تھا۔ قرآن کریم مکمل کر چکی تھی ایم اے فائنل نفسیات کا امتحان دیا تھا، ابھی نتیجہ بھی نہ آیا تھا کہ سکھی سہیلیوں نے مل کر اُسے مہندی لگا کر مایوں بٹھا دیا اور آج وہ پارلر سے تیار ہو کر شادی لان میں لائی گئی، کچھ تو حُسن اور پھر موجودہ دور کی کاریگری

......جو بھی دیکھتا ماشاء اللہ کہہ کر نظرِ بد سے بچنے کی دعائیں دیتا۔

میں کچھ دیر تو بیٹھا رہا۔ پھر شیخ صاحب نے آ کر کہا قاضی صاحب آپ فارم پر کرلیں۔ پھر اپنے بہنوئی برادرِ نسبتی اور ہم زلف کو آواز دے کر بلایا، یوں میں نے فارم پُر کیا لڑکی اور لڑکے کا نام، مہر اور دیگر شرائط درج کیں، صرف لڑکے والوں کی طرف سے دو گواہوں کے نام اور دستخط کے خانے خالی چھوڑ دیئے۔ اس کام کے بعد شیخ صاحب تواضع کے انتظامات دیکھنے چلے گئے۔ کوئی دس بجے کے قریب میرے قریب سے نظریں چراتے ہوئے گزرے۔ میں نے بھی بلا وجہ انہیں نادم کرنے کے بجائے نظر انداز کیا، یہ کوئی نیا معاملہ تو نہ تھا، لڑکی والے بلا وجہ خوش فہمی کا شکار رہتے ہیں کہ دن تاریخ کے موقع پر جو وقت طے ہوا ہے اس کی پاسداری کی جائے گی۔ میں نے تو شاید ہی کبھی دیکھا ہو کہ وقتِ مقررہ پر بارات آئے۔ ہاں اکثر یہ ہوتا ہے کہ شادی کی تاریخ کوئی ہو نکاح اگلے دن کی تاریخ میں ہوتا ہے کیونکہ اسلامی اعتبار سے مغرب کے بعد اور شمسی نظام کے تحت رات بارہ بجے تاریخ بدل جاتی ہے۔ چونکہ میرے لئے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی، اس لئے میں بے فکر تھا مگر شیخ صاحب بے چین اور مضطرب نظر آتے تھے وہ اسٹیج کی ایک جانب کھڑے موبائل فون پر بات کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو سے میں یہ نتیجہ اخذ کر پایا کہ وہ لڑکے والوں سے پوچھ رہے ہیں کہ بارات روانہ ہوئی یا نہیں؟ اور جواب میں یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ بس اگلے چند منٹ میں بارات چلنے والی ہے جس سے میں نے اندازہ کیا کہ بارات تقریباً تیس کلومیٹر کے فاصلے سے آ رہی ہے ڈیڑھ گھنٹہ مزید لگے گا۔

موبائل فون پر گفتگو کے بعد شیخ صاحب اپنے تینوں قریبی اعزا اور بیٹوں کے ہمراہ کھڑے تھے، پھر شرکاء میں سے چند افراد مزید گفتگو میں شامل ہوئے اور پھر یہ سب لوگ آگے کی طرف گئے جہاں چند خواتین بھی اس گفت وشنید میں شدّ ومد سے شامل ہوگئیں۔ اسی دوران شیخ صاحب ان کے درمیان سے نکل کر میری طرف آئے اور بولے قاضی صاحب! نکاح نامے کے فارم کا ایک اور سیٹ ہے؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا مگر آپ کا فارم ...... وہ میری بات ادھوری چھوڑ کر واپس گئے پھر ان کے چھوٹے بیٹے نے اپنی شیروانی اُتار کر ایک نوجوان کو دی جس نے اُسے زیب تن کیا پھر چند افراد اسے اسٹیج کی طرف لے گئے۔ شیخ صاحب اور ان کے تینوں اعزا اور دیگر چند افراد میرے پاس آئے اور نیا فارم پُر کروانا شروع کیا۔ میں حیران وششدر تھا مگر کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پاتا تھا۔ فارم دوبارہ پُر ہوا مگر اس مرتبہ دولہا کا نام تبدیل تھا۔ اب کی بار لڑکے والوں کے گواہوں کے نام بھی لکھوا دیئے گئے۔ تینوں رشتہ دار رسمی کارروائی کے لئے فارم خواتین کی طرف لے گئے، واپسی پر با آواز بلند سلام کیا، میں نے کچھ پوچھنا چاہا تو شیخ صاحب بولے قاضی صاحب! نکاح پڑھایئے جس پر میں سٹیج پر چلا گیا۔ گواہوں اور دولہا کے دستخط کے بعد خطبہ، ایجاب وقبول اور دعا ہوئی۔ نکاح ہوتے ہوتے رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ شیخ صاحب نے مجھے ساڑھے پانچ ہزار روپے ادا کرتے ہوئے یہ بھی جتلایا کہ ڈھائی ہزار نکاح کے اور تین ہزار تین گھنٹے انتظار کے۔ وہ بولے ہماری خوشی ہے کہ آپ بھی کھانا تناول فرمائیں۔

جو کچھ گزشتہ ایک گھنٹے میں وقوع پذیر ہوا اک خواب سے کم نہ تھا۔ میری خواہش یہ تھی کہ دیکھوں اب کیا ہوگا۔ شیخ صاحب کے کھانا

تناول کرنے کی دعوت نے حیلہ بھی فراہم کر دیا۔ میں کھانے سے زیادہ متوقع حالات سے واقفیت چاہتا تھا۔ تقریباً ساڑھے بارہ بجے کھانا شروع ہوا۔ انواع و اقسام کی نعمتوں سے بھرپور یہ طعام انتہائی لذیز تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کھاؤں اور کیا چھوڑوں۔ ابھی میں مکمل طور پر کھانے سے فارغ نہ ہوا تھا کہ اچانک مہمانوں کی ایک بھیڑ شادی لان میں داخل ہوئی، جس کے ساتھ ہی شیخ صاحب اپنے بیٹوں اور قریبی اعزا کے ہمراہ باہر کی طرف لپکے، میں بھی کھانا ادھورا چھوڑ کر اُن کے پیچھے ہولیا۔ وہ بارات جس کا شیخ صاحب کو چار گھنٹے قبل انتظار تھا آ چکی تھی، مگر اسے لان میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ ہاں! باراتی کھانا شروع دیکھ کر اپنے اصل کام میں مشغول ہو گئے۔ شیخ صاحب کے سامنے لڑکے کے والد، چچا اور دیگر قریبی رشتہ دار کھڑے تھے، دولہا اپنے ہمراہیوں کے ساتھ کار ہی میں اس غیر متوقع صورتِ حال سے بے خبر بیٹھا تھا۔ شیخ صاحب نے کہا اکرم صاحب! اب آپ واپس چلے جائیں کیونکہ آپ نے میری بات اور عزت کا خیال نہیں کیا، میں نے ہر رسم میں آپ کی بات مانی مگر تاریخ والے دن ہاتھ جوڑ کر التجا کی تھی کہ وقتِ مقررہ پر آئیں، مگر آپ نے بیٹی کے باپ کو حقیر اور لاغر سمجھتے ہوئے اس کی اس چھوٹی سی خواہش کو بھی ٹھکرا دیا، آپ سے قبل بھی میری بیٹی کے کئی رشتے آئے مگر وہ معاشرتی اعتبار سے میرے برابر کے نہ تھے اس لئے میں انہیں خاطر میں نہ لایا آج دو گھنٹے کے انتظار نے مجھے یہ احساس دلایا کہ برابری ہر جگہ مناسب نہیں۔ فاطمہ آپا نے اپنے بیٹے طلحہ کے لئے رشتہ مانگا تھا جسے میں نے پسند نہ کیا۔ حالانکہ طلحہ ایم بی اے کے بعد بہترین ملازمت کر رہا ہے۔ رشتہ قبول نہ کرنے کے باوجود وہ پرانی رشتہ داری کے ناطے حسبِ روایت آج کی تقریب میں بھی تھے۔ میں نے آپ کے رویے سے بد دل ہو کر انہیں رشتے کی پیش کش کی جو انہوں نے قبول کر لی۔ الحمد للہ نکاح کی رسم ادا ہو چکی اب آپ تشریف لے جایئے اور ہاں! صبح دس بجے تک جہیز کا تمام سامان بحفاظت واپس پہنچ جانا چاہیے بصورتِ دیگر گیارہ بجے رینجرز اور پولیس کی گاڑیاں آپ کے گھر پر ہوں گی، اسی دوران دولہا اپنے دوستوں کے ساتھ گاڑی سے باہر آ چکا تھا۔ اس غیر متوقع کیفیت کے بعد وہ غصے میں اپنے گُلّے کو نوچنے لگا تو شیخ صاحب کی گرج دار آواز گونجی میاں! یہ بھی ہماری طرف سے گیا تھا ایک پتی بھی ٹوٹی تو نیا رکھوالوں گا۔

اس کے بعد بارات بنا دلہن واپس روانہ ہوئی۔ باراتیوں کو آوازیں دی جا رہی تھیں، کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا لیکن لشٹم پشٹم یہ قافلہ روانہ ہوا۔ میں لان میں واپس آیا تو سلامی کی رسم ہو رہی تھی۔ شیخ صاحب نے اپنے داماد کو کار کی چابیاں دیں اور پوچھا ''میاں! گھر پر دلہن لے جانے کا انتظام بھی ہے؟'' طلحہ کی ماں فاطمہ بولیں ''بھائی صاحب! اتنا اچانک یہ سب کچھ ہوا، بھلا کیسے......''

شیخ صاحب ان کی بات کاٹ کر بولے ''کوئی بات نہیں۔'' موبائل فون پر نمبر ملایا اور آواری ہوٹل کے منیجر سے پوچھا ایک کمرہ آج کے لئے؟'' یقیناً اس نے رضامندی ظاہر کی ہوگی۔ پلٹ کر شیخ صاحب بولے'' آپ فکر نہ کرو عروسی شب یہ جوڑا ہوٹل میں منائے گا۔''

یہاں سے واپسی پر میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر دو چار ایسے واقعات اور ہو جائیں تو ممکن ہے پابندیِ وقت کا اہتمام ہونے لگے۔ دل میں گدگدی ہوئی، تاخیر کا نقصان تو نہ ہوا تین ہزار روپے بھی تو ملے ہیں مگر اس وقتی راحت سے مستقل بہتری ہی اچھی ہے!

ڈاکٹر شاہدہ پروین

بدلہ

اپنے پیاروں کے ہاتھوں اسے کیسا روگ لگ گیا تھا......اور ایک دن وہ بازی ہار گئی!

یہ بات کل کی نہیں بلکہ بیس برس پہلے کا قصہ ہے۔ اِن بیس برسوں میں کتنا کچھ بدل گیا۔ زندگی کی دیوار سے میں نے ماہ وسال کے بیس کیلنڈر اتار دیے۔ میں بیس برس بڑی ہوگئی اور میری عمر کے سنہری خزانے سے دو عشرے کم ہو گئے۔ احساسات و جذبات کے کئی نئے پیرایے میرے دل و دماغ کی سرزمین پر وارد ہوئے۔ کتنا فرق ہے آج کے ارادوں اور ماضی کے منصوبوں میں! ان بیس برسوں کے دورانیہ میں بیس روز خزاؤں نے بہار کا سبز لبادہ اوڑھا اور خوشبوئیں میرے آس پاس بکھریں۔ لیکن ان ڈھیر سارے دنوں میں ایک خزاں کا موسم میری یادوں کی فائل سے نہیں مٹ سکا اور وہ لمحہ تھا میری کلاس فیلو منزہ کے سفرِ آخرت کا۔ جب وہ یاد آئے تو بالکل ایسے لگتا ہے جیسے ابھی کل ہی کی تو بات ہے، کہ ہم یونیورسٹی بس بھر کے اس کو رخصت کرنے فیصل آباد گئے تھے اور وہ اپنے گھر کے صحن میں سفید کورا کفن پہن کے لیٹی تھی۔ جوان بیٹی کی موت پر رو رو کر ماں کی آنکھیں سوج چکی تھیں اور ہچکیاں بند ہو چکی تھیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اب اس میں اس جوان میت پر رونے کا حوصلہ ہی نہ تھا۔ وہ واقعی ایسی تھی جسے جوان کہا جا سکے، سروقد، متناسب جسم، کھلتا ہوا گندمی رنگ، لمبے گیسو، قدرت نے اس کو خوب فیاضی سے سنوارا تھا۔ مجمع میں کھڑی وہ دور سے نظر آ جاتی تھی۔ عظیم جثہ کے باوجود اس کا دل بہت ہی منا سا تھا کہیں مردوں کا مجمع دیکھتی تو لمبی لمبی ٹانگیں کانپنے لگ جاتیں اور وہ سہمی ہوئی چڑیا بن جاتی۔ اچھے رزلٹ کا اسے بہت شوق تھا اور وہ اس کے لیے کوشش بھی کرتی تھی ہر اچھے سے اچھے نوٹس کو حاصل کرتی۔ خود کہا کرتی تھی کہ اگر محض نوٹس اکٹھے کرنا ہی سنہری کامیابی کی ضمانت ہوتا تو میں ضرور اول آتی۔

پارٹ ون کے آخری دنوں میں سنا کہ منزہ کی شادی ہو رہی ہے۔ شادی کے نام پر جو رنگوں کی خوبصورت قوس قزح نوجوانوں کے چہروں پر اترتی ہے اس سے اس کا خوبصورت چہرہ خالی تھا۔ خالی سپاٹ چہرہ ویرانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ہم نے اسے معمول کا معاملہ سمجھا کہ پڑھائی کی مصروفیت کی بنا پر اس کے دل میں خوشیوں کی پھوار نہیں پھوٹی۔

پلک جھپکتے میں وہ شادی کے سارے مراحل گزار کر واپس ڈیپارٹمنٹ آ گئی۔ نئی نئی اشیا، زیور اور کپڑوں ...... لیکن بجھی آنکھوں اور پژمردہ جذبوں کے ساتھ! سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ خوش کیوں نہیں ہے؟ اس نے تفصیل بتائی نہ ہم نے کریدا۔ صرف یہی نہیں کہ وہ خوش نہ تھی بلکہ ہر وقت اس کی آنکھوں میں پت جھڑ کا موسم ٹھہرا رہتا تھا۔ کھوئی کھوئی

،بکھری بکھری وہ نہ جانے کچی مٹی کو کرید کے کون سی لیکریں بناتی رہتی تھی ۔ وہ یونیورسٹی ہاسٹل میں بھی میری ہمسائی تھی ۔ کچھ دن وہ چھٹی پر رہی ۔ چند دن بعد خبر آئی کہ منزہ بہت بیمار ہے اور اس نے ایک ماہ کی میڈیکل رخصت لے لی ہے ۔ امتحان سے چند دن قبل وہ واپس آئی ۔ اس کی حالت بہت خراب تھی ۔ وہ پیپر نہیں دے سکتی تھی ۔ اس نے ضمنی امتحان دینے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن ایک خواہش اسے بے چین کیے دے رہی تھی اور وہ تھی Thesis کرنے کی خواہش ۔ اور قانون کے مطابق ضمنی امتحان والوں کو تھیسز نہیں ملتا تھا ۔ میں چونکہ کلاس کی نمائندہ تھی اس لیے میرے پاس آئی اور اصرار کیا کہ اساتذہ کے پاس میرے ساتھ چلو کہ پیپر چھوڑنے کے باوجود Thesis ملنے کی کوئی صورت تلاش کی جا سکے۔ لیکن بیماری کی بنا پر اسے اتنی نقاہت ہو رہی تھی کہ چند قدم چلنا دوبھر ہو رہا تھا ۔ وہ دو قدم چلتی اور زمین پر بیٹھ جاتی ۔ اس طرف جانے والی کوئی سواری بھی نہ مل پا رہی تھی ۔ گرتے پڑتے بڑی مشکل سے چیئر مین صاحبہ کے گھر پہنچے وہ گھر پر موجود نہ تھیں ۔ چھٹی کا دن تھا ۔ واپسی کے لیے مجبوراً ایک پاس سے گزرنے والی گاڑی سے لفٹ لے کر بڑی مشکل سے مریضہ کو ہاسٹل واپس پہنچایا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں نے اس سے سوال کر دیا کہ تم نے شادی پر خوش ہونے کے بجائے یہ کیا روگ اس ''پیاری عمارت'' کو لگا لیا ہے ۔ اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور وہ چھوٹے بچوں کی مانند بلک بلک کر رونے لگی ۔ اس نے بتایا کہ اس سارے روگ کا سبب اس کی شادی ہے جو ناپسند جگہ پر ہوئی ہے ۔ اکلوتی بیٹی ہونے کے باوجود، ماں باپ کی بڑی لاڈلی اپنے ماں باپ کو اس فیصلے سے نہ روک سکی ۔ اس کی شادی خالہ زاد سے ہوئی تھی وہ جب بھی شادی سے انکار کا ارادہ کرتی تو ماں کے الفاظ کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجنے لگتی ''میں تجھے اپنا دودھ کبھی معاف نہ کروں گی'' وہ بے بس ہو کر مقید پرندے کی مانند قفس کی دیواروں سے سر ٹکراتی ۔ بالآخر اس نے ماں کی مرضی کے آگے ہتھیار ڈال دیے ۔ اس کی ماں پر اس کی خالہ کا احسان تھا جو اس کے رشتے کی صورت میں چکایا جانا تھا، اس نے اس فیصلے کو قبول ضرور کیا لیکن اس کے دل و دماغ میں ایک جنگ جاری ہوگئی ۔ دل اس شادی پر رضا مند نہ تھا جبکہ دماغ ماں باپ کی خوشنودی کے لیے ہزاروں تاویلیں گھڑ گھڑ کے اسے مطمئن کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا ۔ بالآخر شادی کے ڈیڑھ ماہ بعد اسے برین ہیمبرج ہو گیا اور چند دن بعد وہ خوبصورت توانا ڈیل ڈول چارپائی پر بے بس پڑا تھا ۔ ماں کے بین آسمان کا کلیجہ چیر رہے تھے ۔ اس موت پر ہر آنکھ اشکبار تھی ۔

یہ کیسا فیصلہ تھا؟ کیسا احسان کا بدلہ تھا؟

والدین بچوں پر صدقے واری جاتے ہیں انہیں اچھا کھلاتے اور اچھا پہناتے ہیں، خوبصورت کھلونے، لباس اور پسند کی ہر چیز لا کے دیتے ہیں لیکن ان سب تحفوں کے بدلے میں اس سے اس کی زندگی گزارنے کا حق کیوں چھین لیتے ہیں ۔ شادی کے بارے میں جائز حدود کے اندر پسند کی اجازت اور اختیار تو ہمارے مذہب نے بھی عطا کیا ہے ۔ پیدا کرنے والے قادر کریم نے وسعتِ قدرت کے باوجود

انسان کو خلافِ طبع مجبور نہیں کیا۔ اگر بچے اپنے اس حق سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہ ہوں تو والدین کو اپنے جبر کے ''حق'' سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ ساری عمر اس کے ہر فیصلے کو مان کر اسے خود فیصلے کرنے کی عادت ڈال کر سب سے اہم فیصلے کے وقت اس کا اختیار مسدود کر دیتے ہیں۔ پھر ایسے فیصلے کرتے ہوئے یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ''فلاں کی بیٹی بھی اپنی شادی پر خوش نہ تھی آج دیکھو چار بچوں کی ماں ہے اور اپنے گھر میں خوش و خرم ہے'' کون جانے وہ کرب کے کس پل صراط سے گزر کر جھوٹی خوشی کی وادیوں میں اتری ہے۔ دلیل دی جاتی ہے کہ سب ہی سیٹ ہو جاتے ہیں اور منزہ نے شاید اسی نظریے کو غلط کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ وہ اپنے Thesis کے لیے پریشان تھی چند دنوں میں زندگی کی بازی ہار گئی۔ اس کا اجڑا ہوا چہرہ پیغام دے رہا تھا کہ سب سیٹ نہیں ہو جاتے، کچھ جاں سے ہی گزر جاتے ہیں اور کچھ ساری زندگی جاں کنی میں ہی گزارتے ہیں۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

محبت کی صلیب

''اصل محبت تو شادی کے بعد کی ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے خواہ کتنے ہی دعوے ہوں لیکن حقیقت میں وہ دعوے ہی ہوتے ہیں ان دعووں کو شادی کے بعد ہی پرکھا جاسکتا ہے۔''

میڈم روبی نے اپنی انگلی میں پڑی عقیق کی خوبصورت انگوٹھی کو صحیح زاویہ دیتے ہوئے پرخیال انداز میں کہا۔

''اگر آپ کے خیال میں ان دعووں کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی تو لڑکا اور لڑکی دونوں ہی ان دعووں پر اس قدر اعتبار کیوں کرتے ہیں؟''

نوجوان اور خوبصورت مس سیما نے اپنا دوپٹہ ایک انداز سے کاندھے پر ڈالا۔ سیما کی شادی نہیں ہوئی تھی، اور میڈم روبی کی شادی کو ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ اب تو اُن کی سب سے بڑی بیٹی اسی سکول میں ساتویں جماعت کی طالبہ تھی۔ روبی کی شادی محبت کی شادی تھی۔ بقول اُن کے محبت کے احساس کے بعد شادی تک کا عرصہ ایک سال کا ہوگا۔ یہ ایک سال انہوں نے یوسف کو پرکھتے اور یوسف کے دعووں پر یقین سے ایمان کی کیفیت تک پہنچتے گزارے تھے۔

سیما اکثر اُن سے اس موضوع پر باتیں کرتی رہتی تھی۔ شادی زیادہ کامیاب کون سی ہوتی ہے...... پسند کی یا بغیر پسند کی۔

میڈم روبی کا کہنا تھا کہ ''یہ بات بالکل الگ ہے کہ شادی پسند کی ہونی چاہیے یا نہیں اور یہ بات بالکل الگ کہ شادی سے پہلے پیار محبت کے روپہلی جال کا شکار بننا یا بنانا ٹھیک ہے یا نہیں۔''

''ہاں تو میڈم روبی آپ اس بارے میں اپنی حتمی رائے دیجئے آپ کی رائے آپ جانتی ہیں کتنی اہم ہے خاص طور سے میرے لئے !!''

''ہوں تو یہ بات ہے؟''

میڈم روبی نے ایک بار پھر انگوٹھی کو گھمایا، شاید یہ ان کا غیر اختیاری سا فعل تھا۔ پھر انہوں نے سیما کو مسکرا کر دیکھا۔

''بچی کن ہواؤں میں ہو یہ تو بتاؤ!''

''سچی بات ہے ابھی تو کسی بھی ہوا کے ساتھ لگنے کا فیصلہ نہیں کیا لیکن مجھے آپ کی تجربہ کار رائے کی اس سلسلے میں بے حد ضرورت ہے۔''

''صاف صاف پوچھو سیما تم مجھ سے کس معاملے میں رائے لینا چاہ رہی ہو'' انہوں نے پرس میں سے کچر نکال کر اپنے بالوں کی آوارہ لٹوں کو قید کرلیا۔

سیما کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔ پھر اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ پیریڈ ختم ہونے کا گھنٹہ زور سے بجا۔ شاید کچھ الفاظ بھی اس کے منہ سے نکلے تھے جو

گھنٹے کی آواز میں دب گئے تھے۔اگلا پیریڈ میڈم روبی کو لینا تھا اور کلاس بھی سینئر تھی لہٰذا انہوں نے جلدی سے پرس سے آئینہ نکال کر اپنا جائزہ لیا، دوپٹہ ٹھیک کیا اور قمیض کے دامن کو درست کرتی اٹھ گئیں۔اٹھتے اٹھتے انہوں نے سیما کے شانے کو تھپتھپایا۔

''اوکے! سیما اس موضوع پر ہم بات کریں گے۔ وقت نکال کر.....''

سیما نے سر ہلایا۔اچھا ہی تھا کہ اب سٹاف روم لبالب بھر گیا تھا۔اگلا پیریڈ بہت ساری ٹیچرز کا فری تھا۔

''شاید چھٹی جتنی بچوں کے لئے نشاط افزا خبر ہوتی ہے اُس سے کہیں زیادہ ٹیچر کے لئے ہوتی ہے...... ہے نا؟''

مس صبیحہ نے چھٹی سے کچھ پہلے لبالب بھرے سٹاف روم سے پوچھا۔اگرچہ شور میں ان کی آواز سب تک نہ پہنچ پائی لیکن جس نے سنا اس نے سر ہلایا۔لیکن میڈم روبی نے صبیحہ کے برابر بیٹھے ہونے کے باوجود کوئی جواب نہ دیا۔

''روبی تمہیں میری بات سے اختلاف ہے؟''

''کونسی بات سے؟''

''یہ ہی کہ بچوں سے زیادہ چھٹی کا انتظار اور خوشی ہمیں ہوتی ہے۔''

''نہیں اصل میں ہر ایک کے اپنے اپنے حالات ہیں جو خوشی اور غم کا باعث ہوتے ہیں۔''

سامنے بیٹھی سیما نے پھر ایک نظر روبی کو دیکھا۔''اپنے اپنے حالات'' مجھے اسی موضوع پر تو بات کرنی ہے لیکن میرا خیال ہے نہ روبی اس نقار خانے میں بات کرنا چاہیں گی اور نہ مجھے تسلی ہو گی۔پھر ان سے ڈاکٹر کی طرح ٹائم لے کر مناسب جگہ بات کرنی ہوگی۔

''آنے والا ہفتہ ٹھیک رہے گا۔'' سیما نے روبی سے وقت لے ہی لیا۔انہوں نے سیما کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دے ڈالی۔''نہیں نہیں تکلف بالکل نہیں بس مجھے آپ سے کچھ وقت چاہیے۔''

''اچھا ٹھیک ہے پھر یوں کرو صبح گیارہ بجے تک آ جاؤ''

''آپ کے میاں صاحب کی بھی چھٹی تو نہیں؟ وہ گھر پر ہوں گے؟''

''نہیں نہیں ہفتہ کیا وہ تو اتوار کو بھی مشکل سے ہی ہوتے ہیں......تم آرام سے آنا۔''

سیما کو میڈم روبی کا یہ جملہ کچھ عجیب سا لگا لیکن بہر حال اس بارے میں کچھ اور پوچھنا مناسب نہ تھا۔چلو ہفتہ کو تو ملنا ہے شاید اس معمہ کے بارے میں بھی کچھ بتائیں کہ میاں صاحب اتوار کو بھی گھر پر رہنا کیوں پسند نہیں کرتے اور اگر گھر پر نہیں ہوتے تو کہاں ہوتے ہیں۔

اوہو میں بھی خالص عورتوں کے انداز میں کھوج کرید اور تجسس کر رہی ہوں۔سیما نے ساری سوچیں جھٹک کر پرس اٹھایا۔چھٹی ہو چکی تھی۔گھر پر امی نے کیا پکایا ہوگا! کتنی بھوک لگ رہی ہے اللہ کرے بھنڈی گوشت بنایا ہو۔سیما نے اپنے پسندیدہ سالن کے بارے سوچ کر ہونٹوں پر زبان پھیری۔

سیما چار بہنوں کی پانچویں بہن تھی، دو بھائی تھے۔ سب کی شادی ہو چکی تھی اب صرف سیما باقی تھی۔چاروں بہنوں اور دو بھائی سب کی شادی ماں باپ کی پسند سے ہوئی

تھی اور اپنے اپنے گھروں میں سب خوش تھے۔ایک بھائی بھابی ساتھ رہتے تھے اوپر کے حصے میں اور نیچے امی ابو اور سیما۔ جب بھابی کچھ اچھی چیز بناتیں تو نیچے ضرور بھجواتیں اور اسی طرح امی بھی۔محبتیں قائم تھیں۔اکثر چھٹی کے دن کوئی نہ کوئی بہن اپنے بچوں کے ساتھ موجود ہوتی۔امی کا کہنا تھا کہ انہوں نے اسی لئے باورچی خانہ الگ رکھا ہے کہ بچیاں جب آئیں بلا تکلف آئیں اور جو چاہیں پکائیں کھائیں۔

چاروں بہنیں اپنے اپنے گھر میں خوش تھیں۔بچوں میں مگن تھیں۔سسرال سے تعلقات بھی سب کے ہی ٹھیک تھے۔شاید ان کی وجہ امی تھیں جو انہیں وقتاً فوقتاً مشوروں کے ساتھ ساتھ غلط باتوں پر ٹوکتی رہتی تھیں لیکن سیما کو پتہ نہیں کیوں یہ سب روٹین کی طرح لگتا تھا۔سیدھا سادا نہ جوش و جذبہ نہ کوئی سنسنی خیزی...... کیسے کیسے فلمی ڈائیلاگ سناتی ہیں سہیلیاں، جن کی پسند کی شادیاں ہوئی ہیں باہر گھومنے، ہوٹلوں میں کھانے پینے کے قصے کہانیاں...... کیسا مزہ ہے، کیسی خوشی ہے،کیسی کامیابی؟ سیما یہ سب جاننا چاہتی تھی۔اگرچہ یہ سب سہیلیوں کے قصے کہانیوں سے ظاہر تھا لیکن پتہ نہیں کیوں اسے ان کی باتوں پر اطمینان اور یقین نہیں تھا۔ظاہر کچھ اور اندر کچھ کا شک ہوتا تھا۔اپنے آپ کو کامیاب ظاہر کرنے کا انداز......لگتا تھا کہ ناکامی گویا انتہائی بے عزتی ہے، باہم ساتھیوں میں مسابقت کا جذبہ تو ہوتا ہی ہے سو انداز وہی کہ ہم نے جو کیا صحیح کیا...... ہمارا فیصلہ ٹھیک تھا۔اپنی پسند سے ہم سفر چننے میں جو مزہ ہے وہ باقی سب میں کہاں......

ان معاملات پر اس قدر سوچ بچار کے بھی کئی اسباب تھے۔کئی نظریں جو اٹھتی تھیں تو قدموں سے لپٹتی محسوس ہوتیں، ہم سفر بننے کی دعوت نامے، ساتھ دینے اور ساتھ چلنے کے لئے بڑھتے ہاتھ، سیما کا دل کہتا تھا کہ وہ بھی وہ ہی کرے۔پھر ہاتھ بڑھانے میں ہرج ہی کیا ہے! اچھا ہے مزاج سے واقفیت ہو جائے تو ذہنی ہم آہنگی ہو جائے گی۔بعد میں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔''بس ہو جانے دو'' دل دینے اور دل لینے کی نشاط آمیز کیفیات کا تجربہ...... پھر پسند کی شادی کا تجربہ کر لینے میں کیا نقصان ہے آخر ہر طرف اس کا شور ہے ایسا ہو رہا ہے اور لوگ خوش ہیں۔

''بی بی پھوپھو! بی بی پھوپھو اب اٹھ بھی جایئے...... آج چھٹی کا دن ہے دیکھئے تو گیارہ بج گئے ہیں دادی کتنی دفعہ غصہ ہو چکی ہیں...... پھر آپ کو یاد نہیں آج آپ نے ہمارے ساتھ پارک چلنے کا وعدہ کیا تھا؟''

منیبہ نے اپنی پھوپھو کو جھنجھوڑ کر اٹھانے کی کوشش کی لیکن سیما پر اس کے ہلانے جلانے سے زیادہ اثر اس خبر نے کیا کہ گیارہ بج گئے ہیں۔میڈم روبی نے ٹائم دیا تھا۔وہ بستر سے ایک جھٹکے سے اٹھ گئی۔

''سیما آج کچھ مہمان آرہے ہیں۔کچھ ناشتے میں بنا لو ہر چیز بازار کی دینی اچھی نہیں لگتی۔''

سیما کے باتھ روم سے نکلتے ہی امی نے اس سے کہا۔

''لیکن امی آج تو مجھے میڈم روبی کے گھر جانا تھا۔''

''انہیں روز تو ملتی ہو، دل نہیں بھرا؟''

''امی پلیز جانے دیں میں ایک گھنٹے کے اندر آجاؤں

گی......آپ کے خاص مہمان تو شام کو ہی آئیں گے نا!''

امی نے خفگی سے دیکھا لیکن سیما نے پیار سے گلے میں بانہیں ڈال کر ماں کو منا ہی لیا۔

ادھر منیبہ کو چوکلیٹ کا لالچ دیا

چائے کے ساتھ ایک سلائس لے کر جلدی سے نکلی۔

''بس امی ابھی گئی ابھی آئی یہ چند گلیوں کے بعد ہی تو میڈم کا گھر ہے۔''

امی کے خاص مہمان آرہے ہیں پتہ نہیں بعد میں کیا ہو!

اس نے دل میں سوچا۔ ہونہہ کیا ہوگا...... وہی ہوگا جو ہوتا آیا ہے......کسی کے گلے تو پڑنا ہی ہے......لیکن گلے ہی تو نہیں پڑنا......مرضی اور خوشی کے ساتھ ہونا چاہیے۔

میڈم گھر کے کاموں میں الجھی تھیں۔ گھر میں داخل ہوتے ہی سیما کو اندازہ ہو گیا۔ پھیلا ہوا گھر اور الجھی الجھی تھکی تھکی روبی ......شاید میڈم کی ماسی نہیں آئی تھیں لہٰذا لگتا ہے کہ آج بات نہیں ہو سکے گی۔ سیما نے مایوسی سے سوچا۔

لیکن میڈم روبی نے شاید اس کی سوچ پڑھ لی تھی۔

''سوری سیما میں بھول ہی گئی تھی کہ تم کو آنا ہے۔ دیر سے سو کر اٹھی ماسی شاید بیل بجا بجا کر چلی گئی۔ لیکن کوئی بات نہیں ......آجاؤ ہم تھوڑی دیر سب کچھ بھول کر بات کر لیتے ہیں۔''

''سمیعہ بھی ابھی تک سو رہی ہے۔''

میڈم نے اپنی بیٹی کے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور سیما کو لے کر ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔

''اور سر؟''

''او ہ ظفر تو چھٹی کے دن بھی آفس میں رہنا پسند کرتے ہیں۔''

سیما کے سوال پر میڈم روبی مسکرانے لگیں لیکن ان کی مسکراہٹ میں پتہ نہیں کیا تھا کہ سیما کو لگا وہ مسکرا رہی ہیں لیکن ان کا دل رو رہا ہے۔

''تمہاری تو بہت سی سہیلیاں ہیں جنہوں نے محبت کی شادی کی ہے تم نے ان سے کیوں نہیں معلوم کیا؟''

''ہاں آپ صحیح کہہ رہی ہیں لیکن مجھے لگا کہ ان کے مقابلے میں آپ کی رائے اور مشورہ زیادہ بہتر اور قابل بھروسہ ہوگا۔''

''ہوں......سیما میں تمہیں جو مشورہ دوں گی مانو گی بھی؟''

''یعنی آپ کا مشورہ اس شرط کے ساتھ ہوگا؟''

''نہیں اب ایسا بھی نہیں لیکن مشورہ دینا اسی وقت اچھا لگتا ہے جب یہ معلوم ہو کہ اس مشورہ کی قدر بھی ہوگی ...... ویسے تو ہمارے ہاں مشورے اور مفت کے مشورے دینے والوں کی کمی نہیں لیکن میرا شمار ان میں نہیں ہے۔''

میڈم روبی پھر عادتاً اپنی انگلی میں پہنی ہوئی عقیق کی انگوٹھی گھمانے لگیں۔

''میں آپ کے پاس آئی ہوں تو اسی لئے کہ آپ کے مشورے کی میرے لئے اہمیت ہے۔''

''دیکھو سیما! یہ جو محبت کی کہانیاں ہیں، اب زندگی کے اس مرحلے پر آکر پتہ چلتا ہے کہ یہ سب بس فلموں اور کہانیوں میں ہی پڑھنے میں مزہ آتا ہے۔ اصل محبت تو وہ ہے جو نکاح کے دو بولوں کے بعد دل کی زمین پر اس طرح خود بخود اُگ آتی ہے جیسی بارش کے بعد خود بخود ہریالی......لیکن اگر اس ہریالی کو نکاح کے بندھن سے پہلے کاشت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ دل کی سرزمین کو ہی سیم زدہ بنا دیتی ہے وہ سارے حسین خواب اور پر لطف ارادے جو دکھائے جاتے ہیں، شادی کے بعد ایسے ٹوٹتے ہیں کہ ان کی کرچیاں نہ سمٹ پاتی ہیں نہ چنی جاتی ہیں۔ بعد کی ساری زندگی ان ہی کرچیوں پر چلتے گزرتی ہے۔''

انہوں نے ایک لمحے کو ٹھہر کر گہری سانس لی۔

''وہ پیارا سا گھر دینے اور چاند تارے آنگن میں اتارنے کی باتیں بس باتیں ہی رہتی ہیں حقیقی زندگی میں تو دو میٹھے بول سننے کو دل ترس جاتا ہے۔ شاید وہ سارے بول اپنی مٹھاس پہلے ہی لٹا چکتے ہیں۔ لیکن سب سے تکلیف دہ بات پتہ ہے کیا ہوتی ہے؟''

انہوں نے سیما کی آنکھوں میں جھانکا۔

''یہ کہ آپ اپنوں سے شکایت بھی نہیں کر سکتے کیونکہ یہ سب کچھ آپ نے خود اپنے ہاتھوں انتخاب کیا ہوتا ہے۔ آپ کو سہارا دینے والے کوئی نہیں ہوتے۔ ماں باپ کی پسند اور دعاؤں سے شادی کرنے والوں کے شکوے شکایت کے مسلمہ حقوق ہوتے ہیں۔ لیکن آپ تو اپنے لبوں کو سی لینے پر مجبور رہتے ہیں اور شاید وہ دعائیں بھی آپ کو نہیں ملتیں جو فرمانبردار بچوں کے حصے میں آتی ہیں۔''

میڈم روبی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی نہ جانے کب کب کے ضبط کیے آنسو تھے۔ سیما نے آگے بڑھ کر گلے لگایا تو جیسے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ سیما انہیں دلاسا دیتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ خود کو محبت کی سولی پر چڑھائے رکھنا بھی کتنا مشکل اور صبر آزما ہے!

دعوت

بیگم سعید نے اپنے شوہر کے مشورے پر کرامت اور ان کی بیگم کی دعوت کا اہتمام کر کے صحیح کیا تھا یا غلط یہ ان کی سمجھ میں کبھی نہ آ سکا۔ کرامت اور نوران کے خاص احباب میں تھے اور ان کی شادی کی سالگرہ کی دعوت اپنے گھر کر کے ان کو سرپرائز دینا ان کا مقصد تھا۔

دعوت میں وہ سب کچھ ہو رہا تھا جو کینیڈین پاکستانیوں کی دعوتوں کا معمول ہے۔ کچھ مہمان لونگ روم میں اور کچھ فیملی روم میں جمع تھے۔ رعنا، غزالہ اور حمیدہ یہ تینوں مریم سعید کی بہت گہری دوست تھیں۔ گپ شپ اور وقفے وقفے سے قہقہوں کے ساتھ مریم کے کاموں میں ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ لونگ روم میں مرد پاکستان سے لے کر دنیا بھر کے حالات تک بول رہے تھے۔ آوازوں کے سر اوپر نیچے ہو رہے تھے اور جب کوئی کسی کی ٹانگ کھینچتا تو ہلکی سی تو تو میں میں اور پھر ہنسی کے فوّارے پھوٹتے۔

بیچ بیچ میں اقتصادی تنگی (Recession) کی بات حاضرِ موضوع کے طور پر چھیڑ دی جاتی۔ جمیل کا تعلق رئیل اسٹیٹ سے تھا اور یقیناً ریسیشن کے متعلق وہ جتنا جانتے ہوں گے شاید ہی کوئی اور جانتا ہوگا۔ وہ اس موضوع کو بار بار لے آتے اور اپنی انا کی تسکین کا سامان بہم کرتے۔ حمیدہ کے شوہر بہت ہی مذہبی مزاج کے تھے، اگر چہ عمر تیس پینتیس ہو گی، خاموش بیٹھے تھے۔ کبھی کبھی کسی موضوع پر بولتے تو یوں بولتے جیسے کوئی بچوں کو درس دیتا ہو۔ سعید ان کو چھیڑتے ''حنیف تم بھی تو کچھ بولو'' اور وہ اکثر و بیشتر ہنس کر چپ ہو جاتے۔ دروازے کی گھنٹی بجی سعید اٹھ کر گئے۔

''ارے یار کبھی تو وقت پر آ جایا کرو۔ نام کرامت ہے لیکن ہو سدا کے لیٹ لطیف۔'' سعید کی آواز لونگ روم تک آئی۔

''تم تو گھر کے اندر بیٹھے ہوئے ہو، تمھیں پتہ ہے باہر کتنی زبردست اسنو فال ہو رہی ہے۔ گاڑی بھی آہستہ آہستہ چلاتا ہوا آیا ہوں۔'' کرامت کی سردی سے کانپتی ہوئی آواز نے جواباً کہا۔

کرامت کے پیچھے ان کی بیگم نور اور ان کا سولہ سالہ بیٹا حارث داخل ہوئے۔ حارث تو بیس منٹ (Basement) میں چلے گئے جہاں ان کے ہم عمر لڑکے اور لڑکیاں جمع تھے۔ نور لونگ روم میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں سے ملنے کے بعد فیملی روم کی طرف چل دیں اور کرامت نے لونگ روم میں اڈہ جما لیا۔ ''سعید بھائی بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' کسی نے آواز لگائی۔

''شاہد بھائی کھانا تیار ہے۔ بس کرامت اور نور بھابی کا انتظار تھا۔'' مریم کی آواز نے جواب دیا۔

چھوٹے سموسے تو پہلے ہی مہمانوں کی نذر کیے جا چکے تھے، اپی ٹائزر کے طور پر۔ اس دوران وہ مہمان بھی انتہائی خاموشی سے لونگ روم میں آ چکے تھے جو گیسٹ روم میں بادہ نوشی کر رہے تھے۔ سعید اور کرامت بھی ایک چکر وہاں کا لگا آئے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں سب کو کھانے کے لیے بلایا گیا۔ کھانے کے دوران بھی باتیں، لطیفے، قہقہے اور ایک دوسرے پر جملے کسنے کا سلسلہ چلتا رہا۔ بیچ بیچ میں کرامت جو رنگ پر آ گئے تھے وہ لطیفے سناتے اور پورا گھر قہقہوں سے گونج اٹھتا۔

کھانا ختم ہوا ۔ تھوڑی دیر کے بعد سب کو ڈِزرٹ (Dessert) کے لیے بلایا گیا۔ جیسے ہی کرامت اور نور ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے ان پر پھولوں کی بارش کے ساتھ لڑکے اور لڑکیوں نے Happy Aniversary Song گایا۔ پھر دونوں سے کیک کٹوایا گیا۔

''زبردست سرپرائز تھا۔'' کرامت خوش دلی اور شکر گزاری کی آمیزش والی آواز میں سعید اور مریم سے مخاطب ہوئے۔

سعید نے جواب دینے کا تکلف نہیں کیا اور اپنے دوست کو لپٹا لیا۔

اس کے بعد تحفوں اور شکریوں کا سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ سب نے تحفے دیے۔ کرامت اور نور سب سے گلے ملے اور سب کا شکریہ ادا کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد چائے کا دور چلا پھر کافی کا بعد میں سب کو نیچے بلایا جانے لگا۔

بیس منٹ (Basement) میں ہلکی ہلکی دھن پر لڑکے اور لڑکیاں بچے، بچیاں رقص کر رہے تھے۔ پھر بڑوں سے کہا گیا، کچھ جوڑوں نے رقص کرنا شروع کر دیا۔ سعید، کرامت اور حنیف تینوں ایک صوفے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ نور بھی سب سے باتوں میں مصروف تھی۔ سب کا اصرار بڑھا کہ ان لوگوں کو بھی رقص میں شریک ہونا ہوگا۔ حنیف نے تو صاف منع کر دیا کہ میں اور حمیدہ اس میں حصہ نہیں لیں گے اور سب کو ہنسی ہنسی میں یہ دھمکی بھی دی کہ اگر مجبور کیا گیا تو پہلے وہ ایک خطبہ ارشاد فرمائیں گے۔ سعید نے دونوں کو معاف کر دیا۔ نور نے بھی بہانہ بنا کر جان چھڑانے کی کوشش کی لیکن کرامت نے کہا کہ ''بچوں کا دل رکھنے میں کیا حرج ہے۔'' کرامت نے نور کو راضی کرنے کی کوشش کی۔ ''میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر نور کسی کام سے اوپر گئیں۔ سعید حنیف سے گفتگو میں مصروف تھے کہ اچانک ان کو اپنے کندھے پر وزن محسوس ہوا۔ وہ چونکے اور دیکھا کرامت نے ان کے کندھے پر سر رکھا ہوا تھا۔ سعید نے کرامت کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن کرامت کی گردن ایک طرف لڑھک گئی۔

''یہ کرامت کو کیا ہوا؟'' سعید چیخا۔

سب لوگ متوجہ ہو گئے۔ کرامت کو صوفہ پر لٹا دیا گیا۔

شور سن کر نور بھی اوپر سے بھاگی بھاگی آئی۔ کرامت کی یہ حالت دیکھ کر اس نے بے اختیار رونا شروع کر دیا۔ فوراً نائن ون ون (911) کال کی پیرامیڈ (Para med) والے تھوڑی دیر کوشش کرتے رہے پھر ہسپتال لے کر چلے گئے۔ سب لوگ دل کے ایمرجنسی وارڈ کے باہر لابی میں

جمع تھے، سب خاموش تھے، نور مستقل رو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آیا اس کو دیکھ کر سب کی امیدیں بندھ گئیں مگر اس نے کرامت کی موت کی تصدیق کر دی۔ کرامت کا رڈیو ویسکولر فیلیئر کا شکار ہو گئے تھے۔

رات کے دو بج رہے تھے، نور صدمے سے بے حال تھی۔ سعید مریم اور دو تین اور دوست نور کو لے کر کرامت کے گھر گئے۔ سب کو بتا دیا کہ Funeral کل مسجد میں ہو گا اور بعد نمازِ عصر تدفین کی جائے گی۔ نور کو بار بار بے ہوشی کے دورے پڑ رہے تھے، آخری دیدار کے وقت نور کی حالت بہت بگڑ گئی تھی۔ اس وقت اسے اپنوں کی ضرورت تھی مگر اس ''دیارِ غیر'' میں یہی سب اپنے تھے جو اس کے آس پاس تھے جو سب کچھ سنبھال رہے تھے۔ جو اس کے غم میں برابر کے شریک تھے۔ قبرستان مین تدفین سے قبل کسی نے آواز لگائی۔ مرحوم کو قبر میں لٹانے سے قبل کسی وارث کی رضا لینی تھی۔ لیکن حارث قبرستان میں موجود نہیں تھا...... ان کا اپنا بیٹا......

''حارث کہاں ہے؟ میں نے مسجد میں بھی اسے نہیں دیکھا۔'' سعید بولے۔

''مجھے پتہ ہے وہ کہاں ہوگا۔'' حسان بولا۔

''تو بلاؤ اس کو جلدی'' سعید نے حسان کو تاکید کی۔

حسان نے فون کیا ''فون نہیں اٹھا رہا ہے'' حسان بولا۔

''چلو میرے ساتھ'' سعید نے حسان کا ہاتھ پکڑا اور اس کو لے کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

حسان اور سعید ایک کافی ہاؤس میں داخل ہوئے۔ حارث اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔

''تمھارے باپ کی تدفین ہو رہی ہے اور تم یہاں بیٹھے ہو۔'' سعید نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''میں کیا کروں گا انکل، آپ سب لوگ ہیں نا۔'' حارث نے جواب دیا۔ اس کا جواب سن کر سعید کا دل چاہا کہ مار مار کر اس کی کھال کھینچ دے۔ سعید نے حارث کا ہاتھ پکڑا اور اسے گاڑی میں لا بٹھایا اور بولا ''تدفین کے وقت تمھاری اجازت لی جائے گی، تم مرحوم کے بیٹے اور وارث ہو۔''

کرامت کے سوئم میں کرامت اور نور کے تمام احباب اکٹھے تھے اور سعید بہت دُکھ سے بول رہے تھے۔

''کرامت نے اسلام آباد میں اپنی اتنی اچھی نوکری چھوڑی، رشتہ داروں سے جدائی کا غم سہا، اپنا وطن چھوڑا...... صرف اپنے بیٹے حارث کے اچھے مستقبل کے لیے اور حارث......''

پھر بہت ہی غمگین لہجے میں بولے۔

''دفن کرنے میں اور گاڑنے میں کیا فرق ہوتا ہے، وہ آج ہم سب نے دیکھ لیا...... کرامت کا اکلوتا بیٹا حارث اپنے باپ کے سوئم میں بھی شریک نہیں ہوا تھا۔''

کرامت اپنے دوستوں میں حارث کا ذکر کرتے ہوئے کہتے تھے۔ ''میں حارث سے بالکل مطمئن ہوں، وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا آج کا مثالی نوجوان ہے، زندگی میں آگے بڑھنے والا...... حقیقت پسند اور غیر جذباتی......۔''

(مونتاج، مارچ ۲۰۱۱ء)

۞۞۞

ڈاکٹر ثمین ذکاء

داستانِ عطا و بخشش

ہمارا رب ہی مسبب الاسباب ہے

حج سے واپس آئے تو انہیں گلاسکو شہر کے ایک نفسیاتی کلینک میں چند ماہ کا جاب ملا۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ اسلامک مشن کی عمارت چند منٹ کے فاصلہ پر تھی وہاں جب تعارف ہوا تو امام مسجد نذرالحق صاحب انہیں بہت پسند آئے۔ عالمِ دین ہونے کے ساتھ اسلامیات اور عربی میں ایم،اے تھے، علامہ اقبال کے شیدائی تھے۔ کام سے ایک گھنٹے کا وقفہ کھانے کیلئے ہوتا تھا، اپنی کھانے کی چیز کوئی سینڈوچ وغیرہ گھر سے لے جاتے۔ چائے کا انتظام وہاں تھا۔ تقریباً 5 4 منٹ روزانہ پیر سے جمعہ تک قرآن پڑھنے اور سمجھنے میں صرف ہونے لگا۔ وہ بڑی تیزی سے دین کو سمجھنے میں مصروف تھے۔

چھٹی کے دن مجھے کچھ بتانے کی کوشش کرتے مگر بچوں کی کمپنی میں گھر کے اندر کچھ بھی میرے پلّے نہ پڑتا۔ پھر یہی طے ہوا کہ خواتین کیلئے اسلامک سینٹر میں ہی بندوبست کیا جائے، میں نے بھی اپنی چند ایک سہیلیوں سے مشورہ کیا وہ بڑے شوق سے راضی ہو گئیں اور ہفتے کا دن تین سے چار بجے کا وقت طے ہوا۔

اتفاق سے اس عرصہ کے دوران ان سینئر عالم صاحب کو دوسرے شہر بھیج دیا تھا اور ایک جوان سے عالمِ دین مدینہ کے تعلیم یافتہ آئے تو انہیں گلاسکو بھیج دیا۔ وہ ڈھاکہ کے تھے، اب حالات خراب ہونے کی وجہ سے جماعتِ اسلامی نے انہیں ادھر بلا لیا۔ وہ جماعت کے خرچہ پر ہی عالم بننے گئے تھے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے تین چار بچے بھی تھے۔

ہمارا پروگرام اس طرح طے ہوا تھا کہ بیس منٹ مولانا مائیک پر دوسرے کمرے میں درسِ قرآن دیں گے۔ مسز زاہدہ قریشی ایک حدیث تیار کر کے لائیں گی اور میرے ذمے دس پندرہ منٹ سیرت النبی پر روشنی ڈالنا تھا۔

پہلا درس انہوں نے توحید پر دیا بہت اچھا تھا سب نے بڑے غور سے سنا۔ ہم نے اپنا بقیہ پروگرام پورا کیا۔ چائے کا انتظام تو وہاں تھا، ہماری سہیلی مسز اشرف مچھلی کے کباب بنا کر لائی تھیں۔ ایک چھوٹی دعا تو مولانا درس کے بعد کراتے، مختصر اختتامی دعا زاہدہ اور میرے ذمے باری باری تھی۔

دوسرے ہفتہ ہم وقت کے مطابق مسجد پہنچے درس شروع ہوا تو وہ آخری سپارہ کی سورہ قیامت کے بارہ میں تھا۔ دوزخ کی ہولناکیاں وغیرہ بیان کرنے کے بعد ہمیں سنائی دیا، کہتے ہیں ''جو پردہ نہیں کرتیں وہ دوزخ میں جلائی جائیں گی۔'' اور مائیک بند ہو گیا ہم تقریباً آٹھ نو خواتین خوفزدہ گم سم بیٹھی تھیں کسی کا بات کرنے کو دل نہ چاہتا تھا۔

ایک زیادہ فیشن زدہ میری سہیلی بولیں اگر جلنا ہی ہے تو پھر تھوڑے فیشن پورے کرلیں۔ دوسروں نے پوچھا اگلے ہفتہ کیلئے کیا کرنا ہے۔ میں نے بتایا کہ فون پر مشورہ کریں گے اس پروگرام کے انچارج ڈاکٹر ذکاء ہیں وہی کچھ فیصلہ کریں گے۔

گھر پہنچ کر انہوں نے پوچھا ساری روداد سنائی اور میں نے کہا کہ امام صاحب نے ہمیں آتے جاتے دیکھا ہوگا جو دوسرے ہی درس میں ایسا خوف زدہ کیا ہے۔

وہ پریشان تو ہوئے مگر کہنے لگے یہ چھوٹی عمر کے ہیں علم تو حاصل کرلیا مگر ابھی تبلیغ دین کی ذرا سی سمجھ بوجھ اور تجربہ نہیں۔ آدمیوں کی محفل میں بھی اکثر اشتعال میں آجاتے ہیں تو ٹھنڈا کرنا پڑتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت و سنت کے مطابق پیغام پہنچانے کیلئے بڑی سوجھ بوجھ اور فہم و فراست چاہیے۔ اگلے روز کہا کہ انتظامیہ سے کہنا پڑے گا وہی عالم دین آئیں وہ بزرگ اور بڑے سمجھدار ہیں انہیں ادھر بھیجا جائے اور یہ تبلیغ کی ابھی کچھ عرصہ ٹریننگ لیں۔

میں نے سب سہیلیوں کو مطلع کردیا چند ہفتوں بعد وہی شاہ صاحب آگئے جب ہمارا پہلا درسِ قرآن تھا تو انہوں نے تمہید باندھی کہ انہیں ہمارا پچھلا تجربہ معلوم ہے اس لیے وہ شروع سے قرآنِ پاک بتائیں گے۔

سورہ فاتحہ مشعلِ راہ

انہوں نے سورہ فاتحہ بہت اچھی سمجھائی اور آخر میں مختصر دعا بھی کی اور یہ نصیحت کی ''الحمد شریف ہدایت کی سورہ ہے اس کو ہر رکعت میں بہت توجہ سے پڑھا کریں اس کے معنی پر غور کریں جب ہدایت آجاتی ہے تو مزید احکامات ماننے آسان ہوجاتے ہیں۔''

اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا سلسلہ بہت اچھا چل پڑا۔ اس جگہ کے تعلق سے اچھی ہلکی پھلکی کتابیں پڑھنے کو ملتی تھیں اور بہت اچھی ہمدرد سہیلیاں میسر آئیں جن میں سے بہت سی سکاٹ لینڈ میں ہی سیٹل ہوگئیں اور ابھی تک ہماری دوستیاں قائم ہیں بلکہ مزید استوار ہوچکی ہیں سچ ہے اللہ تعالیٰ کی خاطر جو محبتیں ہوتی ہیں انہیں دوام حاصل ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کے مشورے سے سیرت النبیؐ کی پہلی کتاب جو آسان الفاظ میں مؤثر کتاب ہے وہ مولانا عبدالحئیؒ صاحب کی کتاب ''حیات طیبہ'' پڑھی۔ دل پر بہت اثر ہوا، آپ ﷺ کیلئے دل میں بہت عقیدت و محبت نے جگہ لینی شروع کردی آپ کی شخصیت آپ کا اخلاق و کردار اور آپ کی تعلیمات عالمِ انسانیت پر اللہ ربِ ذوالجلال کا بہت بڑا احسان ہے۔ آپ محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ ان خصوصی صفات کا حسین مرقع تھے صداقت، وجاہت، شرافت، شجاعت، استقامت، امانت، فصاحت و بلاغت وقار و انکسار اور عالی ظرفی کہ وہ خالقِ کائنات کا بہترین نمونہِ تخلیق ہیں، اسی لیے افضل البشر کہلائے۔

آپ کی سیرت پر اور بھی کتابیں پڑھنے کو ملیں ہمیشہ طائف کے سفر کی داستان اور غارِ ثور میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ گذارا ہوا وقت دل پر بہت اثر کرتے ہیں۔

پہلا دل کا دورہ

ہمیں حج سے واپس آئے چند ماہ ہوئے تھے۔ ڈاکٹر

ذکاء کو پہلا ہارٹ اٹیک ہوا جو کہ کافی سخت تھا، چند دن ہسپتال رہے پھر دو ہفتے کی چھٹی ملی۔ کلینک والا کام ختم ہونے کو تھا انہیں اب Consultant کی نوکری کرنی تھی اس لیے کسی اور ہسپتال میں جانا تھا۔ دعاؤں پر یقین ہمیشہ سے تھا مگر حج کے بعد مزید بڑھ گیا تھا۔ میں اب اسلامک سینٹر سے رابطہ توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اللہ کا کرم ہوا اسی شہر کی دوسری سمت نوکری مل گئی جو کہ ایک ماہ بعد شروع کرنی تھی۔

ہمارا ہفتہ وار پروگرام جاری تھا ایک ہفتہ کو درس میں وہ آیات تھیں جن میں منافقین کا ذکر ہے۔ واپسی پر سارا راستہ مجھے اپنا منافقوں والا حال محسوس ہوتا رہا۔ اب مسجد تو سکارف اور لمبا کوٹ پہن کر آتی اور ہسپتال میں سر نہ ڈھانکتی۔ تقریباً آٹھ سال سے ہماری رہائش اس ہسپتال میں تھی۔ اب یہی الجھن تھی کہ یہاں سکارف لینے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ سے دل کی گہرائیوں سے ہدایت کیلئے دعا کی اور ساتھ جگہ تبدیل ہونے کی التجا بھی۔ البتہ اتنا ضرور کیا کہ ڈاکٹرز کے کامن روم میں گیارہ بجے کافی پینی چھوڑ دی۔ وارڈ سسٹر کے دفتر میں ہی اس کے ساتھ پی لیتی تھی۔

ایک روز اس وقفہ پر ڈاکٹر فریزر (Frazer) کسی مریض کی فائل لینے دفتر آئے تو حیرت سے بولے'' کامن روم کا بائے کاٹ کیوں؟'' جواب دیا'' کوئی خاص بات نہیں ویسے خواتین کی اپنی قسم کی باتیں ہوتی ہیں۔'' تو وہ مسکرا کر چلے گئے۔ پورے ہسپتال میں سات آٹھ ڈاکٹرز کام کرتے تھے مگر ان میں دو سینئر ڈاکٹر Frazer اور Mc Quacker خاصے مشرقی خوبیوں والے شریف انسان تھے دل چاہتا تھا انہیں کلمہ کا پتہ چلے۔ بلکہ ڈاکٹر ذکا صاحب نے چند ایک مرتبہ نہایت طریقے سے پچھلے انبیاء کا بتانا چاہا جیسے حضرت موسیٰؑ کا سمندر کو دو ٹکڑے کرنا اور حضرت نوحؑ کا سیلاب تو یہ لوگ بات کو سائنس کی طرف لے جاتے۔

رُبی

میں داخلہ وارڈ کے لمبے برآمدے کے تقریباً آخر میں پہنچ چکی تھی کہ یکدم پیچھے سے غیر متوازن تیز تیز قدموں کی چاپ سنائی دی اور ساتھ ہی آواز کی پکار بھی،'' ڈاکٹر ذرا رُکیے''۔

قدم وہیں ساکت ہو گئے، جو پلٹ کر دیکھا تو وہ مارگریٹ سمتھ تھی، جو دو روز پہلے ہی سات نمبر وارڈ میں داخل ہوئی تھی اور اس کے ساتھ صرف اتنا ہی تعارف تھا کہ اِس کا پورا معائنہ میں نے کیا تھا۔ دائیں ہاتھ کی کلائی کو گہرے زخم اُس نے خود لگائے تھے۔ جب بھی اُس پر رنج و الم کا دورہ پڑتا، وہ اپنی کلائیاں کاٹ لیتی اور اِسی حالت میں ہسپتال بھیج دی جاتی۔

اِس مرتبہ بھی جب وہ آئی، تو وارڈ سسٹر اور سٹاف کے لیے کوئی نئی مریضہ نہیں تھی۔ معمول کے مطابق اِس کی مرہم پٹی کر دی گئی اور ساتھ ہی معائنہ کے لیے ڈاکٹر کو کال بھیج دی گئی۔ میرے لیے البتہ وہ بالکل نئی تھی، چونکہ مجھے تو اِس ملک میں آئے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ سنہری لمبے بال، بڑی بڑی خوبصورت بادامی رنگ کی آنکھیں، سُرخ و سفید رنگت اور دراز قد کی یہ سمارٹ سی اٹھارہ سالہ لڑکی نجانے کیوں اِس

حالت میں دماغی بیماریوں کے ہسپتال میں آجاتی ہے۔ اُس کا معائنہ کرتے ہوئے کئی ایک سوال ذہن میں آرہے تھے جو ذاتی قسم کے تھے اور وہ مجھے نہیں پوچھنے تھے، البتہ اُس کے انچارج ماہرِ نفسیات اُس کی باری آنے پر انٹرویو کرتے ہوئے تمام باتیں پوچھیں گے، جن میں سے زیادہ تر تو اُس کی ہسٹری فائل میں پہلے سے ہی درج ہوں گی۔ ویسے اُس کی ایک بات سے ذہن کو خاصا دھچکا لگا۔ پچھلی بیماریوں کے متعلق پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ بچپن میں پولیو ہوا تھا، اس لیے ایک ٹانگ ذرا چھوٹی ہے۔

''تمہاری والدہ نے تمہیں پولیو سے بچاؤ کی دوائی نہیں دلوائی تھی؟ وہ جو ہر بچے کے لیے لازمی ہوتی ہے۔''

''ماں تھی ہی کب، جو یہ کام کرتی''۔ اس نے یکدم جواب دیا۔

''تو پھر تمہاری پرورش کس نے کی؟''

''میری نانی نے''۔ اُس کا مختصر سا جواب تھا۔ اُس کے بعد وہ زیادہ باتیں کرنے کے موڈ میں نہ تھی، اس لیے مزید کوئی سوال نہ پوچھا گیا۔

اُس روز جب میں برآمدے میں داخل ہوئی تھی تو اُس نے اپنے وارڈ سے مجھے دیکھ لیا تھا اور بھاگی آئی تھی، جیسے کوئی ضروری بات کرنی ہو۔

قریب آکر ذرا شرمندہ شرمندہ سے لہجے میں کہنے لگی:

''معاف کرنا ڈاکٹر! ایسے ہی راستے میں روک لیا ہے آپ کو۔ دراصل مجھے ایک بات پوچھنی ہے، کیا آپ بتا سکیں گی''؟

''کیوں نہیں، اگر میں جانتی ہوئی تو''!

''کیا میں حُوری بنوں گی''؟

''کیسی حُوری، میں سمجھی نہیں......اوہ''! یکدم میرے منہ سے نکلا......''تمہارا مطلب جنت کی حُور سے ہے، جس کا ذکر قرآنِ پاک میں ہے، مگر تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا''؟

وہ کہنے لگی: ''میں نے پکتھال[1] کا ترجمہ کئی مرتبہ پڑھا ہے، مجھے بہت پسند ہے اور اُس میں سے مجھے یہ سمجھ آئی ہے کہ اچھی لڑکیاں وہاں حُوریں بنیں گی۔''

میں نے بغور اس کا جائزہ لیا، وہ واقعی بڑی معصوم اور خوبصورت سی حُور لگ رہی تھی، سنہری لمبے ریشم جیسے بالوں کی دو چٹیاں آگے ڈالی ہوئیں، غزالی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیر رہی، جیسے بھرے کٹورے ابھی چھلک پڑیں گے۔ وہ میرے جواب کی منتظر تجسّس بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے میں نے کہا: ''مارگریٹ یہ باتیں تو بڑی لمبی ہیں، کوئی مختصر جواب اِس وقت میرے ذہن میں نہیں آرہا۔ اِس وقت میں ذرا جلدی میں بھی ہوں، پھر کبھی فرصت کے وقت اِس موضوع پر تفصیلی باتیں کریں گے''۔ میں نے اِسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

وہ بولی ''اِن شاءاللہ''!

---

[1] مارماڈیوک پکتھال جنہوں نے قرآن پاک کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ یہاں مارگریٹ نے اسی ترجمے کا ذکر کیا ہے۔

’’حیرت ہے، یہ لفظ تم نے کہاں سے سیکھا‘‘؟

’’میری نانی جوانی کے زمانے میں کچھ عرصہ مراکش رہی تھی، وہاں ہر کوئی یہ لفظ استعمال کرتا ہے اور میں نے نانی سے سیکھا ہے‘‘۔

’’بہت اچھا، ان شاء اللہ پھر ملیں گے‘‘ اور میں آگے چل دی۔ اگلے وارڈ میں وہ انچارج ماہرِ دماغی امراض موجود تھے، جنھوں نے مارگریٹ کا علاج کرنا تھا۔ میں ڈاکٹر فریزر سے اِس لڑکی کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی، اِس لیے اُن سے دریافت کیا کہ اُس کا مفصل انٹرویو کب لیں گے۔ اُنھوں نے بتایا کہ کل صبح یا دوپہر کے وقت اُس کی باری آجائے گی۔

’’ویسے میں تو اُس کو پچھلے دو سال سے جانتا ہوں، اس لیے تھوڑے وقت میں ہی انٹرویو مکمل ہو جائے گا‘‘۔ وہ بولے۔

میں نے کہا: ’’مہربانی کرکے صبح ہی کو اُس کو لسٹ پر رکھ لیں کیونکہ دوپہر کو مجھے بوڑھوں کے وارڈ میں جانا ہے۔ اِس لڑکی کی کہانی میں مجھے بھی دلچسپی ہے۔‘‘

وہ مان گئے ’’ہاں ضرور، بلکہ میں تو کہنے والا تھا کہ جب موقع ملے، انٹرویو لینے والے انچارج کے ساتھ شامل ہوا کرو تاکہ تمھیں کچھ دماغی امراض کی معلومات حاصل ہوں۔ تمھارا شوہر تو اِس مضمون کا بہت اچھا ماہر بن چکا ہے‘‘۔

’’جی ٹھیک ہے، کل صبح میں نو بجے مارگریٹ کے وارڈ میں آجاؤں گی‘‘۔

’’ایک بات ہے‘‘۔ ڈاکٹر فریزر نے چلتے ہوئے کہا: ’’تم اُس کی کیس ہسٹری اچھی طرح دیکھ لو تو اُس کو سمجھنے میں آسانی رہے گی‘‘۔

’’جی ٹھیک ہے‘‘۔

اگلے روز میں مقررہ وقت سے پہلے ہی مارگریٹ کے وارڈ میں پہنچ گئی تاکہ اس کی فائل کا مطالعہ کرلوں۔

اُس کی کہانی کی ابتداء ہی ایسی دُکھ بھری تھی کہ غور سے پڑھنے پر ذہن پر خاصہ بوجھ پڑ رہا تھا، مگر میں نے خود ہی اس کام میں ٹانگ اڑا لی تھی، اس لیے اب اُسے پورا کرنا ضروری تھا۔

وہ ابھی اِس دُنیا میں آئی بھی نہیں تھی کہ اُس کا باپ اس کی ماں کو چھوڑ کر اُس شہر سے ہی جا چکا تھا۔ مارگریٹ کی والدہ مَیری بھی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اُس کا والد بھی چھوٹی بچی کو اکیلی ماں کے پاس چھوڑ کر کہیں لاپتہ ہو گیا تھا۔ ماں نے نرسنگ کرکے بیٹی کی پرورش کی تھی۔ مَیری ماں کی خواہش کے مطابق نرس تو نہ بن سکی، البتہ ٹائپنگ وغیرہ سیکھ کر سیکرٹری بن گئی تھی۔ بمشکل بیس سال کی ہو گی کہ اُسی فرم کے منیجر سے دوستی ہو گئی، جس فرم میں وہ جاب کرتی تھی۔ چند ماہ کے اندر اندر والدہ کی مرضی کے خلاف شادی ہو گئی۔ بیچاری ماں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور بیٹی کی خوشی میں شامل رہی۔

مشکل سے ایک سال ہی خوشی کا گزرا ہو گا کہ وہ آدمی کسی دوسرے شہر میں دورے کی غرض سے گیا اور وہاں سے چند روز بعد مَیری کو خط لکھ دیا کہ اب وہ واپس گلاسکو نہیں آرہا،

کیونکہ اِس کو آسٹریلیا میں بڑی اچھی نوکری مِل رہی ہے اور وہ مَیری سے اپنا تعلق ختم کر رہا ہے۔

اِس واقعہ کے ایک ماہ بعد ہی مارگریٹ اِس دُنیا میں آ گئی۔ اُس کی والدہ مَیری کا ہر وقت کا رونا دھونا نانی سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ ایک روز اُس نے مَیری سے کہا کہ تمہاری بیٹی کی پرورش میں کرلوں گی، تم بے شک کسی اور جگہ جانا چاہو تو جا سکتی ہو۔ دو ماہ کی بچی کو چھوڑ کر وہ ایسی لاپتہ ہوئی کہ کبھی پلٹ کر نہ دیکھا۔

جب مارگریٹ دو سال کی تھی تو اُسے پولیو ہو گیا، نانی اس کے ساتھ کافی عرصہ ہسپتال رہی، مگر بچی پوری طرح ٹھیک نہ ہو سکی۔ اُس کے خاص بوٹ بنوا دیئے گئے، جن سے وہ قدرے بہتر چلتی تھی۔ پھر مارگریٹ نے ہائی سکول پاس کیا اور ٹائپنگ سیکھی، مگر ابھی پورے سولہ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اچانک اسے پہلا دورہ پڑا۔ اُس نے اپنی دونوں کلائیاں کاٹ لیں کہ میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔

سوائے نانی کے نہ کوئی رشتہ دار تھا، نہ غم خوار، نہ کوئی سہیلی، نہ کوئی ہمدرد۔ ہسپتال میں وہ اس کا پہلا داخلہ تھا، اُس کے بعد دو مرتبہ اور داخل ہوئی۔ ڈاکٹروں کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اُس کو جلد از جلد ٹھیک کر کے ہسپتال سے گھر بھیج دیں، کیونکہ یہ ماحول بھی اُس کے لیے موزوں نہیں تھا۔ یہاں تو اُدھیڑ عمر یا بوڑھے آدمی اور عورتیں رہتے تھے۔

ابھی میں اس کی کیس ہسٹری کا مطالعہ مکمل کرنے کو تھی کہ ڈاکٹر فریزر آ گئے اور میگی (سب اس کو اسی چھوٹے نام سے بلاتے تھے) کو لے کر انٹرویو کے کمرے میں چلے گئے، میں بھی ساتھ ہی تھی۔

اُس کا حال وغیرہ پوچھ کر سیدھا سوال یہ کیا کہ اِس مرتبہ کلائی کیوں کاٹی؟

''میں زندہ نہیں رہنا چاہتی، پوری دُنیا میں صرف ایک ہمدرد ہستی نانی کی تھی، وہ بھی فوت ہو گئی ہے، اب میں نے اکیلے کیا کرنا ہے''۔ ڈاکٹر فریزر نے اُس کو ہمدردی کے کچھ الفاظ کہے، تھوڑا بہت سمجھایا، اُس کی دوائیوں پر نظر ثانی کی اور اُس کو بستر پر بھیج دیا۔

اُس کے جانے کے بعد میں نے ڈاکٹر فریزر سے کہا: ''محسوس ہوتا ہے کہ مارگریٹ مذہب سے کچھ دلچسپی رکھتی ہے۔ کیا اِس بارے میں اسے کچھ بتایا جا سکتا ہے''؟

''بالکل نہیں''۔ اُنہوں نے یکدم جواب دیا۔ ''ڈاکٹر تم نہیں جانتیں، اِس ملک میں مذہب پر کس قدر بحثیں اور مار کُٹائی تک ہو جاتی تھی۔ عیسائیوں کے دونوں فرقے رومن کیتھلک اور پروٹسٹنٹ ہمیشہ ایک دوسرے سے اُلجھتے رہتے تھے۔ اِس لیے کئی سال پہلے حکومت نے سرکاری اداروں میں مذہب پر ہر قسم کی گفتگو منع کر دی ہے، چنانچہ ہسپتالوں میں اِس موضوع پر بالکل کوئی بات نہیں ہو سکتی''۔

میں نے خاموشی سے سب کچھ سن لیا اور اب اِس فکر میں تھی کہ میگی سے کہاں اور کیسے اِس موضوع پر بات کروں۔ اپنے گھر میں بھی اِس لڑکی کے بارے میں بات ہوئی تو میرے میاں ڈاکٹر ذکاء صاحب نے بتایا کہ میگی کو ہسپتال کا پورا سٹاف جانتا ہے، بلکہ جب وہ پہلی مرتبہ اِس ہسپتال میں آئی تھی تو انہی دنوں انہوں نے یہاں سروس

شروع کی تھی اور اس کا کیس میٹنگ میں زیرِ بحث لایا گیا تھا۔

اِس واقعے سے چند روز بعد کی بات ہے کہ میں ہسپتال کی نچلی سڑک پر سیر کر رہی تھی۔ میرے ساتھ ڈاکٹروں کی بیگمات انجم ہارون، صوفیہ یعقوب اور ڈاکٹر ذکاء کی بہن تحسین جہاں بھی تھیں۔ بہت ہی خوبصورت منظر تھا، بارش ذرا تھمی تھی۔ پھول، پودے، درخت، گھاس وغیرہ سب کچھ دُھلا ہوا صاف ستھرا نظر آ رہا تھا۔ وڈلی ہسپتال اُونچائی پر واقع ہے، تین سڑکیں اُوپر نیچے سامنے والے گیٹ سے پچھلے گیٹ تک جاتی ہیں، اُوپر کی دو سڑکوں پر تو وارڈ اور ڈاکٹروں کے میس، دفاتر اور کئی قسم کی بلڈنگیں بنی ہوئی ہیں، البتہ نیچے والی سڑک پر کوئی تعمیر نہیں، اِس لیے قدرے خاموشی رہتی ہے اور اُس کے دامن میں ایک ندی اُوپر کی پہاڑی سے نیچے کی طرف تیزی سے شور مچاتی، پتھروں پر سر پٹختی گزرتی ہے۔ اُس کا شور بھلا معلوم ہوتا ہے، جیسے خود ہی کوئی راگ الاپ رہی ہو۔ ہم خواتین کی سیر کے لیے یہ پسندیدہ جگہ تھی، البتہ مرد لوگ ہسپتال کے پچھلی طرف پہاڑی کے دامن میں بڑی بڑی چراگاہوں میں سیر کیا کرتے تھے۔

اِس موسم کا لُطف اُٹھاتے ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اچانک مارگریٹ ایک طرف سے نمودار ہوئی۔ پاس آ کر رُکی اور کہنے لگی: ''کیا آپ میرے ساتھ کوئی بات نہیں کریں گی''؟

''کیوں نہیں۔ آؤ یہاں ندی کے پاس جنگلے پر کھڑے ہو کر تمہاری باتیں سنتی ہوں۔ میری سہیلیاں تو اپنی سیر جاری رکھیں گی''۔

اُس وقت وہ خاصی بہتر لگ رہی تھی، اِس لیے اسے باہر آنے کی اجازت مِل گئی تھی۔ وہ کچھ اپنے مسائل کے بارے میں اور کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی اور میں سارا وقت یہی سوچتی رہی کہ اُس کو کیسے خالقِ کائنات کا پتہ بتاؤں اور کیسے اُس سے تعارف کراؤں؟ لڑکی خاصی ذہین تھی، اُس نے میری ذہنی اُلجھن کو بھانپ لیا اور پوچھنے لگی:

''کیا سوچ رہی ہیں آپ''؟

اور اِسی لمحے وہ دیوانہ وار بہتی ندی میری مشکل کا حل بن گئی۔ ''ہاں'' میں نے چونکتے ہوئے کہا: ''میگی! میں یہ سوچ رہی تھی کہ یہ سب چیزیں مثلاً ندی، پھول، درخت پہاڑ وغیرہ کس نے بنائے ہوں گے''؟ وہ بولی: ''اِس بات کا تو مجھے یقین ہے کہ یہ سب خدا نے بنائے ہیں، جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے۔ مگر اس سے آگے میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اُس نے مجھ جیسے انسانوں کو کیوں پیدا کیا''۔

''میگی ہر انسان کی زندگی میں مشکلات ضرور آتی ہیں، مگر حالات تو بدلتے رہتے ہیں، پھر آسانی بھی پیدا ہو جاتی ہے''۔

''ڈاکٹر! یہ دوسروں کے لیے صحیح ہو گا، مگر مجھے تو اپنی زندگی کا کوئی بھی مصرف نظر نہیں آتا۔ صرف ایک ہستی تھی اِس دُنیا میں جس سے مجھے پیار تھا، میری نانی۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ مردوں سے مجھے شدید نفرت ہے، اِسی لیے میں سروس بھی پرائمری سکول میں کرتی ہوں، بطور ٹائپسٹ، وہاں سارا خواتین کا عملہ ہوتا ہے''۔

''مگر یہ ڈاکٹر بھی تو مرد ہیں، جو اتنی ہمدردی سے تمہارا علاج کرتے ہیں''۔

''اِن کو میں فرشتوں کی فہرست میں رکھتی ہوں''۔ وہ بولی اور مجھے ہنسی آ گئی۔

''میگی! اِس روز تم مجھ سے حُوروں کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ حُور بننا اور جنت کی دوسری خوبصورت چیزیں حاصل ہونا انعامات ہیں ان لوگوں کے لیے جو اِس دُنیا میں اچھے کام کرتے ہیں''۔

وہ فوراً بولی: ''ہاں اِس لیے تو میں کوشش کرتی ہوں کہ اچھے کام کروں۔ میں نے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا، نہ کبھی جھوٹ بولا ہے، نہ چوری کی ہے، نہ میرا کوئی بوائے فرینڈ ہے، اِس لیے سوچتی ہوں خدا مجھے ضرور حُوری بنائے گا''۔

اِس معصومانہ تجزیئے پر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ ہمیں باتیں کرتے خاصا وقت گزر چکا تھا، میری سہیلیاں بھی واپس پہنچ چکی تھیں۔ ساڑھے چھ بج رہے تھے جو کہ وارڈوں میں کھانے کا وقت ہوتا ہے، اِس لیے میگی کو بھی جانا تھا، وہ خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

وہ اگست کے آخری دن تھے، ستمبر سے میرا ہاؤس جاب بچوں کے ہسپتال میں شروع ہو گیا جو کہ وڈلی سے بیس میل دُور تھا۔ وہاں دن رات ڈیوٹی کی مصروفیت رہتی، دو ہفتے بعد ہفتہ اتوار کی چھٹی نصیب ہوتی تو اپنے وڈلی والے فلیٹ میں آ جاتی۔ مگر یہاں کے سٹاف اور مریضوں سے کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔ اِس چھ ماہ کے ہاؤس جاب نے بہت تھکا دیا تھا۔ اِس کے بعد چند ماہ کے لیے مجھے وڈلی ہی میں جگہ مِل گئی۔ یہاں بڑی آسانی تھی، جب رات کی ڈیوٹی لگتی تو ڈاکٹر ذکاء خود ہی کال پر چلے جاتے۔ ویسے بھی بقول اُن کے یہ اُن کا اپنا ہسپتال تھا اور زیادہ تر مریض اُن کے جانے پہچانے ہوتے تھے۔

ہر جمعہ کو بارہ بجے ڈاکٹروں کی میٹنگ ہوتی تھی، جس میں سوشل ورکرز بھی شامل ہوتی تھیں جو کہ اِن مریضوں کے متعلق معلومات فراہم کرتیں، جنہیں دوائیوں کے ساتھ گھر بھیجا جاتا تھا۔ اُس روز سب ڈاکٹر اپنے خاص خاص مریضوں کے بارے میں پوچھ گچھ کر کے مزید مشورے دے دیتے۔

کئی ہفتے گزر گئے، ایک روز جمعہ کی میٹنگ کے درمیان اچانک خیال آیا کہ میگی کے متعلق پوچھنا چاہیے۔ ایک اُدھیڑ عمر کی سوشل ورکر مس ہارورڈ اُس کو اچھی طرح جانتی تھیں۔ بعد میں ان سے آہستہ سے پوچھا کہ میگی کس حال میں ہے؟

مس ہارورڈ حیرانی سے میری طرف دیکھ کر بولی: ''ڈاکٹر تمہیں نہیں معلوم''؟

''نہیں کیا ہوا''؟

''میگی نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی تھی۔ دو روز بعد ہمسایوں کی اطلاع پر پولیس نے دروازہ توڑ کر یہ سب دیکھا''۔

یہ بات سُن کر میرے دِل کو شدید دھچکا لگا۔ کاش! میگی کو وہ علم حاصل ہوتا جو اذیتوں کی انتہا میں بھی انسان کو سنبھالے رکھتا ہے۔

میں سوچتی رہی، نجانے کائنات کا مالک اِس ’’حُوری‘‘ کے ساتھ اب کیا معاملہ کرے گا؟

واضح رہے کہ عالمِ اسلام میں خودکشی کا تناسب بہ نسبت دُنیا کے دوسرے ممالک کے بہت کم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زندگی کے مصائب کو صبر وتحمل سے برداشت کرنے کے اُخروی اجر وثواب کی اُمید دلا کر اور خودکشی کو حرام قرار دے کر اِس بات کا بندوبست فرمایا ہے کہ انسان اس عارضی دنیوی زندگی کے دُکھ سُکھ کو صبر وتحمل سے برداشت کر لے اور زندگی سے فرار حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔

(جاری ہے)

یہ کس کی آواز ہے؟

میرے چچازاد بھائی کی شادی تھی جو میرا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا اور میرا بہترین دوست بھی تھا۔ میں نے شادی میں شرکت کرنے کے لیے دفتر سے چار دن کی چھٹی لے لی۔ سفر کی تیاری کر کے میں بس کے اڈے پر پہنچ گیا اور ٹکٹ لے کر انتظار گاہ میں آرام دہ صوفے پر بیٹھ گیا کہ بس کے روانہ ہونے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ میں بے حد خوش تھا کہ میرے کئی پرانے دوست مختلف شہروں سے اس شادی میں شرکت کرنے کے لیے آ رہے تھے۔

اس مشینی دور میں دوستوں کی یہ بیٹھک اک نعمت سے کم نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہم سب مل کر اپنی شرارتوں اور نادانیوں کے قصے دہرائیں گے۔ گزرے دنوں کی خوشگوار یادوں کو یاد کریں گے۔ اپنی حماقتوں پر خود ہی قہقہے لگائیں گے۔ اپنے درمیان ہونے والے چھوٹے چھوٹے بے بنیاد جھگڑوں کو یاد کر کے لطف اندوز ہوں گے۔ آپس کی چھینا جھپٹی کے تصور کو تازہ کریں گے۔ بچپن کی رنگ برنگی اور معصوم خواہشوں کا تذکرہ کریں گے۔ بچپن کے سنہرے دنوں کی وہ انمول یادیں کہ جن کا خیال آتے ہی میری آنکھوں کے سامنے قوس قزح کے رنگ ناچنے لگتے ہیں۔ پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگتی ہیں۔ شوخ اور بھڑکیلے پیراہن میں ملبوس بے شمار تتلیاں اڑنے لگتی ہیں۔ چاروں طرف جگنو چمکنے لگتے ہیں۔ ان گنت خوبصورت پھول کھل اٹھتے ہیں۔ پھر میرے اندر کا سویا ہوا بچہ پل بھر میں جاگ کر میرے وجود پر چھا جاتا ہے اور میں زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر اچھلتا کودتا اپنے بچپن کی حسین وادی میں داخل ہو جاتا ہوں۔ دل چاہتا ہے کہ اس جزیرے پر ہمیشہ کے لیے بسیرا کر لوں۔ لیکن بہت جلد کوئی انجانی قوت مجھے وہاں سے نکال کر میری دنیا میں واپس لے جاتی ہے اور پھر اس طلسم ہوشربا کا ہر دریچہ میرے لیے کچھ عرصہ کے لیے بند ہو جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی روزن سے جھانک کر اس کی ایک جھلک دیکھ لوں لیکن کہیں سے ایک آواز ابھر کر ہوا میں پھیل جاتی ہے۔

”خبردار! اس خوبصورت اور پاکیزہ وادی میں بالغوں کا داخلہ منع ہے۔ اب تمھارے اندر کا بچہ سو گیا ہے۔ جب وہ بیدار ہو جائے گا، تب آ جانا۔“

میرا دل چاہتا ہے کہ میرے اندر کا بچہ ہمیشہ بیدار رہے لیکن اگر کبھی میں اس کوشش میں کامیاب ہو بھی جاتا ہوں تو میرے آس پاس کے لوگ مجھے جینے نہیں دیتے اور وہ مجھے طعنہ دیتے ہیں۔

”ارے! اس اوچھے احمق کو دیکھو۔ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ اس عمر میں بھی بچوں کی سی حرکتیں کرتا پھر رہا ہے اگر بازار میں عقل برائے فروخت ہوتی تو ہم اس کی حماقت پر ترس

کھاتے ہوئے فی سبیل اللہ خرید کر اسے دے دیتے۔''

یہ باتیں سن کر میرا دل چھلنی ہو جاتا ہے۔ میں اپنے اندر کے بچے کو تھپک تھپک کر سلا دیتا ہوں اور چہرے پر سنجیدگی اور تفکر کی چادر اوڑھ کر نام نہاد دانشوروں کی محفل میں قدم رکھ دیتا ہوں۔

اس وقت میں انتظار گاہ میں بیٹھ کر اپنے مہربانوں کے طعن و تشنیع سے محفوظ تھا۔ موقعہ غنیمت جانتے ہوئے میں نے اپنے اندر کے بچے کو چمکارا اور پھر دل ہی دل میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''او بچے جمورے! خوش ہو جا کہ اگلے چند دن تیری آزادی کے دن ہیں۔ اپنی من مانی کرنا اور خوب مزے لوٹنا۔ اس دوران میں سو جاؤں گا اور تو بیدار ہو جائے گا۔ دیکھ! وقت ضائع نہ کرنا اور جاگتے رہنا۔''

ابھی میں اسے یہ تلقین کر ہی رہا تھا کہ بس کی روانگی کا اعلان ہو گیا اور میں اپنا بیگ اٹھا کر انتظار گاہ سے باہر نکل آیا۔ لاہور سے سیالکوٹ روانہ ہونے کے لیے بس تیار کھڑی تھی۔ میں نے اپنا سامان کنڈیکٹر کے حوالے کیا اور خوشی خوشی بس میں سوار ہو گیا۔ مجھے ڈرائیور کے پیچھے والی نشست مل گئی تھی۔ اس نشست کے نیچے لوہے کا پائیدان بنا ہوا تھا۔ میں نے بیٹھ کر اس پر پاؤں رکھے تو مجھے یک گونہ اطمینان ہوا کہ سفر خوب آرام سے گزرے گا۔

میری بائیں طرف والی نشستوں پر میاں بیوی اور ان کے دو چھوٹے بچے بیٹھے تھے۔ ان میں سے بچی کی عمر تقریباً چھ سال تھی اور بچہ چار سال کے لگ بھگ تھا۔ بچے کے ہاتھ میں شوخ رنگوں کی ایک قدرے چھوٹی چھتری تھی جسے وہ محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

مقررہ وقت پر بس اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔ بس ہوسٹس نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر مسافروں کی ٹکٹیں چیک کرنا شروع کر دیں۔ جب وہ میرے بائیں ہاتھ بیٹھے ہوئے میاں بیوی کے پاس پہنچی اور انھیں ٹکٹ دکھانے کے لیے کہا تو اس آدمی نے صرف دو ٹکٹیں اس کی طرف بڑھا دیں۔ اس نے استفسار کیا کہ

''بچوں کے ٹکٹ کہاں ہیں؟''

وہ صاحب کہنے لگے۔

''اس عمر کے بچے ٹکٹ سے مستثنیٰ ہیں۔''

بس ہوسٹس نے قدرے غور سے بچوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اللہ آپ کے دونوں بچوں کی عمر دراز کرے۔ یہ دونوں تو خاصے بڑے دکھائی دیتے ہیں۔ چند روپے بچانے کے لیے آپ بچوں کی عمر کیوں گھٹا رہے ہیں۔''

یہ سنتے ہی وہ صاحب سیخ پا ہو گئے اور چیخ کر کہنے لگے۔

''دہائی خدا کی ...... آپ کا مطلب ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ گویا آپ نے مجھ پر الزام لگایا ہے۔ یعنی آپ نے مجھ پر بہتان باندھا ہے۔ اگر اس وقت یہ بس اڈے پر کھڑی ہوتی تو میں بطور احتجاج نیچے اتر کر دوسری بس لے لیتا۔ میں لعنت بھیجتا ہوں اس سواری پر۔''

یہ کہہ کر انھوں نے ٹانگیں پسار دیں اور اپنی سیٹ پر نیم دراز ہو کر بس ہوسٹس کو یوں دیکھنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں۔

''کرلو جو کرنا ہے۔''

بس ہوسٹس جھینپ گئی اور منہ موڑ کر اپنی کرسی کی طرف چلی گئی۔اس چھوٹی سی جھڑپ کے بعد بس کے اندر خاموشی چھا گئی۔ابھی کچھ وقت ہی گزرا تھا کہ میری بائیں جانب سے چرڑ ...... چرڑ کی ناگوار آوازیں بلند ہونے لگیں۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا تو وہ بچہ اپنی چھتری کو الٹا کر کے اس کے مرکز میں پیوست نوکیلے لوہے کی سلاخ کو لوہے کے پائیدان پر رگڑ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کی گود میں بیٹھا تھا۔اس کے برابر کی سیٹ پر کھڑکی کے ساتھ اس کی بڑی بہن اپنی ماں کی گود میں سوار تھی۔اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

بچے نے دائیں طرف جھک کر چھتری کے لوہے کو زور زور سے پائیدان پر رگڑنا شروع کر دیا۔ پھر اس نے اپنی بہن سے پوچھا۔

''آپا! بتاؤ یہ کس کی آواز ہے؟''

دوسری طرف خاموشی طاری رہی۔ بچے نے چند لمحے جواب کا انتظار کیا اور چھتری کے لوہے کو مزید زور سے رگڑتے ہوئے پوچھا۔

''آپا! بوجھو بھلا یہ کس کی آواز ہے؟''

آپا نے آنکھیں موند لیں اور اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔

بچے نے کچھ دیر تک انتظار کیا، پھر لجاجت سے کہنے لگا۔

''اچھی آپا! یہ کس چیز کی آواز ہے؟ صرف ایک دفعہ بتا دو۔اس کے بعد میں تم سے نہیں پوچھوں گا۔''

لیکن آپا نے تو گویا گونگے کا گڑ کھایا تھا۔اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بچے کو آپا کا یہ رویہ ایک آنکھ نہ بھایا۔اس نے جارحانہ انداز میں پیش قدمی کرتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر آپا کی ٹانگ میں زور سے چٹکی بھری۔ مارے تکلیف کے آپا تلملا اٹھی اور چیخنے لگی ...... آپا کی چیخ و پکار سن کر بچے کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک آ گئی۔ یکا یک سکون اور اطمینان سے بیٹھے ہوئے والدین کو احساس ہوا کہ اب پانی سر سے اونچا ہو رہا ہے اور میدانِ کارزار میں ان کی مداخلت ناگزیر ہو چکی ہے۔لہٰذا ابا حضور نے محبت سے آپا کو سمجھانا شروع کیا۔

''کوئی بات نہیں۔کیا ہوا جو بھائی نے پیار سے چٹکی بھری ہے۔ چھوٹا بھائی ہے ابھی ناسمجھ ہے۔ بڑا ہو جائے گا تو آپ کے ڈھیروں کام کیا کرے گا اور آپ کے لیے بہت مزے مزے کی چیزیں لایا کرے گا۔ بھائی کی بات کا برا نہیں مناتے۔''

لیکن باپ کی طفل تسلیوں سے آپا کی گفتار و کردار میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی اور وہ سراپا صدائے احتجاج بنی رہی۔

پھر اماں نے آپا کے آنسو پونچھتے ہوئے اپنے ترکش سے تیر چھوڑا۔

''بری بات۔اچھے بچے نہیں روتے۔بس اب چپ کر جاؤ۔ سیالکوٹ پہنچ کر میں تمھیں نئی گڑیا لے کر دوں گی ...... چپ کر جاؤ۔''

یہ تیر نشانے پر بیٹھا۔نئی گڑیا کا نام سنتے ہی آپا کی تکلیف کافور ہو گئی۔اس نے اپنے ہاتھوں سے منہ صاف کیا اور کھڑکی سے باہر کے مناظر دیکھنے میں محو ہو گئی۔ کچھ دیر کے لیے بس میں

خاموشی چھا گئی۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور اپنے بیگ میں سے ایک کتاب نکال کر اسے پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ ابھی ایک ہی صفحہ پڑھ پایا تھا کہ چرڑ۔ چرڑ کی وہی ناگوار سی آواز ابھرنے لگی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو وہ بچہ پھر سے اپنی چھتری کو الٹا کر کے اس میں پیوست لوہے کی سلاخ کو زور زور سے پائیدان پر رگڑ رہا تھا۔ اس کے والد ہلکے ہلکے خراٹے لے رہے تھے۔ اور والدہ محبت بھری نظروں سے اپنے سپوت کو تک رہی تھیں۔ میں نے رشک سے اس کے والد کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا کہ اگر یہ شور ان کو مضطرب نہیں کر رہا تو بھلا میں کیوں بے چین ہو رہا ہوں۔ پھر میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ

''بھلے آدمی! تم اتنے کمزور کیوں ہو کہ ذرا سے شور سے ہل کر رہ گئے۔ اپنی بھرپور توجہ کتاب کی طرف مبذول کر دو اور پھر دیکھو کہ یہ شور تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

یہ سوچ کر میں نے ایک نئے عزم کے ساتھ کتاب کو کھولا اور پڑھنا شروع کیا لیکن ہر لمحے کے ساتھ یہ آواز بلند ہوتی چلی گئی اور کتاب کے حروف دھندلاتے چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا گویا کتاب کا ہر حرف چیخ چیخ کر با آواز بلند چرڑ۔ چرڑ کہہ رہا ہو۔ اس احساس کے ساتھ ہی یہ آواز میرے اعصاب پر سوار ہو گئی اور میں نے جھنجلا کر اپنے بائیں طرف دیکھا۔ بچے کے والد بدستور آنکھیں نیم وا کیے نیم دراز تھے۔ میں نے نرمی سے ان کا کندھا ہلایا تاکہ اس گھمبیر مسئلے کے حل کے لیے ان سے مدد کی درخواست کروں۔ انھوں نے آنکھیں کھول کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

''بھائی صاحب! آپ کے بچے کے ہاتھ میں جو چھتری ہے......'' اتنا کہہ کر الفاظ میرے حلق میں اٹک گئے۔ میں نے سوچا کہ اپنا مدعا ایسے خوبصورت پیرائے میں بیان کروں کہ میرے لہجے میں شکایت کا رنگ نہ ہو اور وہ صاحب برا منائے بغیر میری تکلیف کا ازالہ کر دیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں انتہائی موزوں الفاظ کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔

مجھے خاموش پا کر وہ صاحب گویا ہوئے۔

''بھائی صاحب! میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں۔ آپ اس چھتری کے بارے میں پوچھ رہے ہیں جو میرے بچے کے ہاتھ میں ہے۔ ایسی چھتری تو ہر کھلونوں کی دکان سے مل جاتی ہے اس کی قیمت بھی زیادہ نہیں اور اس کے رنگ بھی بہت خوبصورت اور شوخ ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ بہت پائیدار ہے۔ پچھلے ایک سال سے میرا بچہ اس سے کھیل رہا ہے۔ کئی دفعہ یہ اس کے ہاتھ سے گر چکی ہے۔ اپنے دوستوں سے لڑتے ہوئے میرے بیٹے نے کئی دفعہ اس چھتری سے ان کی پٹائی بھی کی ہے۔ غصے کے عالم میں میرے بیٹے نے بارہا اسے زمین پر دے مارا ہے لیکن کیا مجال ہے کہ یہ کبھی ٹوٹی ہو۔''

یہ کہہ کر انھوں نے چھتری کی طرف فخر سے دیکھا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

''اول تو یہ آپ کو لاہور کے ہر بازار میں مل جائے گی۔ کیا عجب کہ سیالکوٹ میں بھی دستیاب ہو لیکن بفرض محال اگر یہ کمیاب بھی ہوئی تو بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ انارکلی سے یہ ضرور آپ کو سستے داموں مل جائے گی۔''

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسی پر مغز معلومات فراہم کرنے پر ان کا شکریہ ادا کروں یا اپنا سر پیٹ لوں۔

آخر جی کڑا کر کے میں نے ان سے کہا۔

''بھائی صاحب! میرا مطلب ہے کہ میں ڈسٹرب ہو رہا ہوں۔ میں کتاب پڑھنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے خاموشی کی ضرورت ہے۔ براہِ مہربانی آپ اپنے بچے کو سمجھائیے کہ وہ اس شغل کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھے۔''

میرا خیال تھا کہ میری بات سن کر وہ نادم ہو جائیں گے۔ اپنے بچے کی سرزنش کریں گے اور مجھ سے معذرت خواہ ہوں گے لیکن اس کے برعکس میری درخواست سنتے ہی ان کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا اور لب ولہجہ بھی۔ وہ غصے سے لال ہو گئے اور کہنے لگے۔

''چہرے بشرے سے تو آپ مناسب آدمی نظر آتے ہیں لیکن دراصل آپ انتہائی کٹھور، پتھر دل اور نامعقول آدمی ہیں۔ آپ سے ایک معصوم بچے کی چھوٹی سی خوشی بھی برداشت نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ آپ اولاد جیسی نعمت سے محروم ہیں۔ اسی لیے اس قدر تنگ دل اور سخت دل ہیں۔ آپ کی بلا جانے کہ اولاد کس چیز کا نام ہے اور شفقت پدری کسے کہتے ہیں۔''

اتنا کہتے کہتے ان کی آواز تند و تیز جذبات کی رو میں بہہ کر بھرا گئی۔ انھوں نے ملتجی نظروں سے اور دردناک آواز سے بس کے مسافروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ے ''دل صاحبِ اولاد سے انصاف طلب ہے''

بس میں بیٹھے ہوئے چند لوگوں نے گردن موڑ کر مجھے گھور کر دیکھا۔ ایک کونے میں سے کسی منچلے کی آواز آئی۔

''پا جی! یہ بس ہے کوئی لائبریری نہیں۔''

دوسری طرف سے دو تین لڑکوں نے قہقہہ لگا کر داد دی۔

پھر کسی عورت نے ممتا بھرے جذباتی لہجے میں کہا۔

''بھائی صاحب! بچے تو سب کے سانجھے ہوتے ہیں۔''

ایک دل جلا فرطِ جذبات سے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔

''بھئی معصوم بچے ہلکی پھلکی بے ضرر شرارتیں کرتے ہی رہتے ہیں۔ بڑوں کو دل بڑا رکھنا چاہیے۔ اب وہ آپ کی طرح بس میں بیٹھ کر کتابیں پڑھنے سے تو رہے۔''

ایک ماہر نفسیات نے پر اعتماد لہجے میں حاضرین بس سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

''بلا وجہ روک ٹوک سے بچوں کے ذہن پر منفی اثرات ثبت ہو جاتے ہیں جو ساری زندگی بچے کے لیے اذیت کا باعث بنے رہتے ہیں، اس میں خود اعتمادی کا فقدان ہو جاتا ہے اور اس کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔''

مذکورہ بالا عوامی تبصروں کی وجہ سے میری شخصیت کے غبارے میں سے ہوا نکل گئی۔ میری ہمت جواب دے گئی اور میں ایک ایسے مجرم کی طرف سر جھکا کر بیٹھ گیا جو ارتکابِ جرم کے بعد ندامت اور پچھتاوے کا شکار ہو کر رہ جائے۔ کچھ دیر کے بعد غلطی کا یہ احساس حسرت میں بدل گیا اور میں سوچنے لگا کہ

کاش! میرے چچا زاد بھائی نے مجھے اپنی شادی پر بلایا ہی نہ ہوتا۔

اگر اس نے مجھے مدعو کرنے کا مصمم ارادہ کر ہی لیا تھا تو

کاش ڈاکخانے کا عملہ اپنی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے میرے نام بھیجے گئے دعوت نامے کو راستے میں کہیں گم کر دیتا اور وہ مجھ تک نہ پہنچ پاتا۔ اگر دعوت نامہ بھی مل گیا تھا تو کاش انہی دنوں میں بروقت نزلہ زکام جیسی کوئی معمولی بیماری آن لیتی اور میں شادی میں شرکت سے معذرت کر لیتا۔

اگر بیماری نے بھی سست روی کا مظاہرہ کیا تھا تو کاش میں اس بس میں سوار نہ ہوتا۔

اگر میری قسمت میں یہی بس لکھی تھی تو کاش یہ بچہ کسی دوسری بس میں سفر کرتا۔

اگر اس بچے کے نصیب میں بھی یہی بس تھی تو کاش یہ اپنی چھتری گھر پر بھول جاتا۔

اگر یہ چھتری بھول نہ پایا تو کاش کوئی رحمدل چور خلق خدا کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر موقع پا کر اسے چرا لیتا۔

باقی سارا راستہ میں لفظ ''کاش'' کے ساتھ مختلف سابقے اور لاحقے لگا لگا کر ان پر غور کرتا رہا۔ نہ جانے غور و فکر کے اس عمل کے دوران میں نے سانس بھی لیا یا نہیں؟ پلکیں جھپکائیں یا نہیں؟ ہاتھ پاؤں کو جنبش دی یا نہیں؟ اس موضوع کے علاوہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچا یا نہیں؟ مجھے کچھ یاد نہیں۔

بہرحال خدا خدا کر کے سفر کٹا۔ جونہی منزلِ مقصود آئی، بس رک گئی اور اس کا دروازہ کھول دیا گیا۔ میں سر نہوڑائے ہوئے تیزی سے دروازے کی طرف لپکا اور چھلانگ لگا کر ایسے باہر نکل آیا جیسے کوئی قیدی عمر قید کی سزا کاٹ رہا ہو کہ شومئی قسمت سے زنداں کی دیوار میں شگاف ہو جائے اور وہ موقع پاتے ہی پہرے داروں سے نظر بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔

گھر پہنچا تو عزیز و اقارب میرے منتظر تھے۔ پرانے دوستوں کو دیکھ کر میرا دل کھل اٹھا اور سفر کی ناخوشگوار یادیں میرے ذہن سے محو ہو گئیں۔ ہم سب مل بیٹھے اور ماضی کی پٹاری کھول کر دلچسپ واقعات اور قصہ کہانیوں کو یاد کر کے لطف اندوز ہوتے رہے۔ خوشی اور مسرت سے بھرپور یہ چار دن گویا سکڑ کر چار مختصر سی گھڑیوں پر محیط ہو گئے اور واپسی کا وقت آن پہنچا۔ میں نے سب کو خدا حافظ کہا اور اپنا بیگ لے کر بس کے اڈے کی طرف چل دیا۔

ٹکٹ خریدا اور بس میں سوار ہو گیا۔ مجھے بس کے درمیان میں اچھی آرام دہ نشست مل گئی۔ میں نے بس ہوسٹس سے اخبار مانگا اور بڑے انہماک سے اسے پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ اسی دوران کسی بچے کی باریک لیکن واضح آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''ارے آپا! یہ تو وہی سڑیل سے انکل ہیں۔''

جواب میں آپا نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں منے بھیا! میں نے بھی انھیں پہچان لیا ہے۔ اب بہت مزا آئے گا۔''

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو مجھ سے تھوڑے فاصلے پر وہی بچہ بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شرارت چھلک رہی تھی، کچھ کر گزرنے کا عزم بھی اور مخصوص فاتحانہ چمک بھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں وہی چھتری تھی اور اس کے شوخ رنگ اب میری آنکھوں میں چبھ رہے تھے۔ جونہی اس کی نظر مجھ پر پڑی، اس نے مجھے دکھانے یا چڑانے کے لیے چھتری کو اپنے

سر سے قدرے اونچا کیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا کوئی سپہ سالار جنگ جیتنے کے بعد علم بلند کر کے اپنی فتح مبیں کا اعلان کر رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی میرے چاروں طرف چرڑ...... چرڑ کی آواز پھیل گئی، میرے قدم میدان سے اکھڑ گئے، میری ٹانگوں میں بجلی در آئی، میں بے اختیار اپنی نشست سے اٹھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بس کے دروازے سے باہر نکل آیا۔

۞۞۞

چلتے چلتے

لیجئے قارئین کرام! اسامہ بن لادن ایک دفعہ پھر 2 مئی 2011ءکو ایبٹ آباد میں جامِ شہادت نوش کر گئے ۔ایک دفعہ پھر اس لئے کہ ہمارے آقا اور ''سچ کے علمبردار'' امریکہ بہادر اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ انہیں بہادری سے پار کرنے کی نوید دنیا کو سنا چکا ہے......اب اس نئی نوید مسرت کو آج مہینہ بھر ہو چلا ہے مگر بیانات میں تضادات کا ایک سلسلہ ہے جو ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔ چلیے اگر بالفرض ان کی تازہ کارروائی پر یقین کر بھی لیا جائے تو انسانی حقوق کا چیمپئن اس کارروائی کو کس کھاتے میں ڈالے گا جس سے اس پر کوئی حرف نہ آئے ۔سرحدوں کی پامالی...... پاکستانی حکومت پر بد اعتمادی نہتے شکار پہ یوں دست درازی...... انسانی بلکہ مسلم لاش کی ایسی پامالی ...... اسامہ بن لادن تو نہ جانے کب کی اپنی مراد پا گیا۔ایک حدیث کی رو سے جب کوئی شخص ارادہ کر کے حج کو نکلے یا جہاد کی راہ لے تو پھر بے شک منزل پہ نہ بھی پہنچے راستے میں ہی اجل آ جائے تو اسے اپنی نیت کے مطابق حج یا جہاد کا اجر وثواب مل جائے گا ۔ یوں اسامہ تو شہادت کی خلعتِ فاخرہ پہن چکے سو چنا امریکہ، اس کے اتحادیوں، حواریوں اور ان محض گفتار کے غازیوں کو چاہیے جو بغض اسلام میں بڑھ بڑھ کر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہے ہیں......شہیدوں کو جاں بحق کہتے ہیں اور مجاہدین کے دشمنوں کو شہادت کا درجہ دیتے ہیں ۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے دیئے ہوئے درجات، خطابات ، القابات کوڑیوں کھوٹے ہیں ...... وہ علیم و بصیر ذات بالاتر ہے اصل درجہ بندی تو اس نے کرنی ہے ۔ یہ تو ہماری آزمائش ہے کہ ہم علم رکھتے ہوئے ...... جانتے بوجھتے ہوئے بھی کس گروہ کا ساتھ دے رہے ہیں؟ اپنی مصلحتیں عزیز ہیں؟ اپنے مفادات آگے ہیں؟ یا امت مسلم کا درد؟ قوم رسولِ ہاشمی کا دکھ محسوس کرتے ہوئے حق کو حق اور باطل کو باطل کہتے ہیں؟ دامے، درے، سخنے اس کا ساتھ دیتے ہیں؟

اللہ قادر مطلق کا ہزار ہزار، بے شمار شکر ہے کہ اس کی توفیق ورحمت سے اپنا یہ حال ہے کہ

دستِ ستم کو دستِ مسیحا نہیں لکھا
میں نے منافقوں کو فرشتہ نہیں لکھا

ایک حدیث کے مطابق اس امت میں قیامت تک کوئی نہ کوئی گروہ......کہیں نہ کہیں جہاد جاری رکھے گا ۔ جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا بھی جہاد ہے پھر جابر حکمران بلکہ حملہ آور کے سامنے مظلوم ومقہور کے حق میں تلوار اٹھا لینا کیسے جہاد نہ ہوگا ...... تاریخ اٹھا لیجئے ...... مطالعہ کر لیجئے ۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف غزوہ بدر کے بعد آج تک

کافر ،مشرک ، منافق برسر پیکار ہی رہے ہیں ۔ جب جب مسلمانوں کو وہن کی بیماری لگی رہی یہ مغلوب ہوتے رہے جب جب یہ اللہ کے بندے بن کر رہے فتح ونصرت نے ان کے قدم چومے اللہ تعالیٰ نے تو قرآن مجید میں فتح وکامرانی کا ایک ہی اصول بتا دیا ہے کہ ’’ تم ہی رہو گے غالب اگر تم مومن ہو‘‘ ہم آج بھی انفرادی اور اجتماعی طور پر اللہ کا راستہ اختیار کرتے ہوئے اللہ کی رسی کو تھام لیں تو اس ہزیمت و شکست کی حالت بدل سکتی ہے ۔کفر تو اندر کھاتے اسلام سے اتنا خائف ہتا ہے اور مرد مومن سے اس قدر ڈرتا ہے کہ شہادت کے بعد بھی اسے ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ پھر سے ہی اٹھ کر نہ آجائے ...... آج جس طرح امریکہ اسامہ سے خوف زدہ ہے اور بقول اس کے اسامہ کی لاش سمندر برد کر دی ہے اسی طرح تاریخ میں بارہا ایسے مسلم خوف سے لرزہ ہر اقدام کفر بچگانہ حرکتیں کرتا رہا ہے ...... محترم صحافی اور یا مقبول جان اپنے ایک حالیہ مضمون میں لکھتے ہیں جو ضربِ مومن جمعہ 20 مئی 2011ء کے پرچے میں شائع ہوا ہے ۔

’’وہ جب تک زندہ رہا ، برطانوی افواج کے دلوں میں اس کا خوف تھرتھراتا رہا ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلم اُمہ کے علاقوں پر یورپی اقوام بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑیں تھیں ۔ برصغیر پر ان کا قبضہ مکمل ہو چکا تھا اور سید احمد شہید کی تحریک ابھی عہدِ طفولیت میں تھی ۔ برطانوی سلطنت پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا ، لیکن اس تاج برطانیہ کو للکارنے والا ایک شخص سوڈان کی سنگلاخ تر زمین میں ان کے خلاف علم بغاوت بلند کر چکا تھا ۔اس نے اپنی سرزمین پر اللہ کی حاکمیت اور خلافتِ الٰہیہ کا نعرہ بلند کیا ۔ سب سے پہلے اسے بادشاہوں کی طرح حکومت کرنے والے اور نام کے مسلمان مصری حکمرانوں سے لڑنا پڑا ۔ یہ وہ حکمران تھے جو عالمی طاقتوں کے سامنے سربسجود ہو چکے تھے ۔ ان پر فتح نے برطانوی طاقتوں کو بیخ پا کر دیا ۔ پہلے تو انہوں نے وہاں پر محصور مصری افواج کو نکالا اور پھر فروری 1884ء میں جنرل گورڈن کو اس شخص کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا ۔

یہ عجیب شخص تھا ۔صحرا میں رہتا تھا ۔نہ محل نہ سیکریٹریٹ ،لیکن انگریزی استعمار کے خلاف جہاد اس کا اوڑھنا بچھونا تھا ۔ مارچ 1884ء میں پہلی ہی جنگ میں برطانوی افواج کے شانہ بشانہ اس کے ساتھ لڑنے والی مصری افواج نے آہستہ آہستہ اپنے کمانڈروں کا حکم ماننے سے انکار کر دیا ۔ بمشکل تمام وہ سوڈان میں موجود پچیس سو برطانوی باشندوں کو نکالنے میں کامیاب ہو گیا ۔ گورڈن کی مدد کے لئے ولزلی کو بھیجا گیا ۔ وہ اس وقت مصر میں موجود برطانوی افواج کا سربراہ تھا ۔صحراؤں اور میدانوں میں جنگیں ہوئیں ۔ وہ خرطوم تک جا پہنچے لیکن 28 جنوری 1885ء میں اس صحرانشین شخص کی افواج جب شہر میں داخل ہوئیں تو برطانوی افواج کے پورے گیریژن کی لاشیں سڑکوں اور محل کی سیڑھیوں پر بکھری پڑی تھیں ۔ جنرل گورڈن کا کٹا ہوا سر فٹ بال کی طرح لڑھک رہا تھا ۔ ولز کی افواج نے بھاگ کر سمندری جہازوں میں پناہ لی تو آگ کے گولے ان کا تعاقب کر رہے تھے ۔

اس ذلت آمیز شکست کے بعد اس صحرائی مجاہد محمد احمد مہدی سوڈانی نے شرعی قوانین نافذ کئے اور شرعی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا گیا یہ وہ زمانہ تھا جب پورے عالم اسلام میں مرعوب اور شکست خوردہ مسلمان مغربی تعلیم اور مغربی لباس میں اپنی شناخت گم کرنے کو عافیت سمجھتے تھے ۔مہدی سوڈانی کو بدنام کرنے کے لئے برطانوی آقاؤں کے وفادار مولویوں نے کفر کے فتوے لگائے ۔ ان فتوؤں میں ایک فتویٰ یہ بھی شامل تھا کہ جہاد صرف حکومتِ وقت ہی کر سکتی ہے۔کسی ایک شخص کو تنظیم بنا کر جہاد کرنے کا کوئی حق نہیں ۔ خواہ حکمران مغربی آقاؤں کی غلامی میں اپنے آقاؤں سے بھی سو قدم آگے نکل چکے ہوں ۔

یہ شخص جس کو اس زمانے کی سب سے بڑی عالمی طاقت برطانیہ شکست دینے کا خواب دیکھتی تھی ، 22 جون 1885ءکو اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔اس کے انتقال کے چار سال بعد مارچ 1889ء میں لارڈ کچز کی سربراہی میں برطانوی افواج نے سوڈان پر قبضہ کرلیا،لیکن مہدی سوڈانی کا خوف اس قدر تھا کہ سب سے پہلے اس کی قبر کھودی گئی ۔ اس کی لاش کو نکال کر جلایا گیا اور راکھ دریائے نیل میں بہادی گئی تاکہ کلکولوگ اس شخص کے مزار کو عقیدت کے طور پر اپنا مرکز نہ بنالیں ۔ پھر وہاں جمع ہوکر سوڈان کے لوگ ایک دفعہ پھر شرعی نظام کے نفاذ کے لئے متحد نہ ہوجائیں ۔

مہدی سوڈانی کا خوف آج بھی مغرب کے دلوں میں ویسے ہی بسا ہوا ہے ۔اسی لئے جب امریکا نہ پوری دنیا میں آبادی کے کنٹرول کا پروگرام شروع کیا اور اس کے لئے مسلمانوں کو مفت مانع حمل ادویات فراہم کرنا شروع کیں تو جارج مارشل کے پلان کے مطابق سی آئی اے کی پالیسی اور اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کی قومی سلامتی کی یادداشت نمبر NSSN200 میں تحریر ہے:’’ سیاہ فام افریقیوں میں اسلام کی اپیل قدرتی ہے ۔ اسلام بھائی چارے کا مذہب ہے اور مغربی افریقہ میں محمڈن ازم کا ایک بہت بڑا جتھا بھی موجود ہےاور ساحلی علاقوں کے نیگروں کی روز افزوں تعداد اسلام قبول کر رہی ہے ۔ہمیں ایک اور سیاہ فام مہدی کے ظہور سے چوکنا رہنا چاہیے ۔ یہ سب لوگ مل کر ایک قومی حکومت بنا سکتے ہیں اور یہ 30,25 ملین جنگجو لوگ سارے سیاسی ڈھانچے کو اتھل پتھل کردیں گے ۔‘‘

مہدی سوڈانی کا یہ خوف تھا جب اس کی قبر کھودی گئی ۔ لاش جلا کر دریا کے سپرد کردی گئی اور اس کی کھوپڑی کو لارڈ کچز نے دوات کے طور پر استعمال کیا تو اپنے زیرنگیں علاقوں میں اپنے کاسہ لیس علماء اور بکاؤ لکھنے والوں کے ذریعے اسے تخریب کار ، کافر ، مرتد ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ۔ بہت کم ایسے تھے جو مہدی سوڈانی کی لاش کی بے حرمتی پر سراپا احتجاج ہوئے ۔ سوائے ان لوگوں کے جو اُسے برطانوی استعمار کے خلاف اللہ کی حاکمیت کے نفاذ کا علمبردار سمجھتے تھے ۔اسی لئے جب لارڈ کچز سمندر میں ڈوب کر مرا تو ظفر علی خان نے زمیندار میں تحریر کیا ۔

؎ حضرت مہدی کی تھیں جس نے جلائی ہڈیاں
حق نے آبِ شور میں اس کی جلائی ہڈیاں

آج مہدی سوڈانی کو انتقال کئے 126 سال ہو چکے

ہیں اور خوف ہے کہ دلوں سے جاتا ہی نہیں، لیکن اُسامہ بن لادن کو اللہ کے حضور اپنی جان کا نذرانہ پیش کیئے چند دن بیتے ہیں۔ یہی دلیل ہے کہ ہم دفن اس لئے نہیں کر رہے کہ اس کے مزار سے کوئی تحریک جنم نہ لے لے۔ جس شخص کی میت دکھانا امریکہ کی سلامتی اور سکیورٹی کے لئے خطرے کا باعث ہو، اس کا خوف کتنی دیر تک امریکا کے دلوں میں بستا رہے گا۔ شاید کئی نسلیں اس خوف سے کانپتی رہیں۔

مہدی سوڈانی ہو یا جنوبی امریکا کا چی گویرا، دونوں کی لاشوں کی بے حرمتی کی گئی۔ چی گویرا کی لاش کو ہیلی کاپٹر سے لٹکا کر دکھایا گیا۔ اس وقت ان لوگوں کو خوف کے عالم میں شہید نہیں کہا جاتا تھا لیکن آج چی گویرا کی تصاویر دنیا کے ہر خطے میں محبت سے آویزاں ملیں گی اور مہدی سوڈانی کا نام جس عزت و تکریم سے لیا جاتا ہے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ تاریخ بتاتی ہے کہ کون عزت کی موت مرا؟ کس نے ظلم اور زیادتی کے خلاف لڑتے ہوئے شہادت حاصل کی اور کون تھا جو ظالموں کے ساتھ تھا؟ کس نے ایمان بیچا اور کس نے ظلم کو جائز قرار دیا؟

اس وقت بھی برطانیہ کے ظلم کو جائز قرار دینے والے دانشور موجود تھے اور آج عرق، افغانستان اور فلسطین ضرظلم و سربریت اور درندگی کا جواز دینے والے ''اہل علم'' کی بھی کمی نہیں ایسے لوگوں کے نام تاریخ نے پہلے بھی ردی کی غلیظ ٹوکری میں پھینک دیئے اور زندہ ان کا نام رکھا جو استعمار کے خلاف کھڑے تھے۔ جن کا خوف آج بھی مغرب میں آباد ظالموں کی نیند حرام کر دیتا ہے۔ تف ہے ہم پر کہ لاشوں اور قبروں میں سوئے ہوئے لوگوں سے خوفزدہ اقوام کے سامنے ہم ایسے جھک جاتے ہیں جیسے اس کائنات کا فرمانروا اللہ تعالیٰ نہیں بلکہ یہی طاقتیں ہیں۔'' (نعوذ باللہ)

قارئین! سچ ہی تو ہے۔

؎ جنہیں تھا زعم خدائی ، وہ گردِ راہ بنے
جنہیں تھا خوفِ الٰہی، جہاں پناہ بنے

ایبٹ آباد آپریشن سے ہمارے حکمران بھی ایک ایسی کڑّکی میں آ گئے ہیں کہ کیا بتائیں کڑکی آپ سمجھتے ہیں نا کسے کہتے ہیں؟ اردو میں اسے چوہے دان کہتے ہیں۔ اس میں رات کو روٹی کا ٹکڑا لگا کر اس میں رکھ دیتے ہیں جہاں چوہوں کی کثرت ہو چوہا پیٹ بھرنے کیلیئے روٹی پہ جھپٹتا ہے کہ اس کی گردن کڑکیّ میں پھنس جاتی ہے یوں روٹی تو کیا ملنی تھی جان سے بھی جاتا ہے۔

ہمارے حکمرانوں کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہوا ہے ......ڈالر کے بدلے کیا کیا کچھ نہ کیا، مشرف صاحب کی لکھی کتاب گواہ ہے ......اپنوں کو بیچا ...... لہو سے ہاتھ رنگے ......اندرون وطن سنجیدہ و فہمیدہ حلقے کی مخالفت مول لی مگر ہوا کیا وہ اتحادی ...... وہی امریکہ ......یعنی کہ بِگ باس یوں چپ چپاتے ایبٹ آباد کارروائی کر کے واپس بھی چلا گیا اس نے اپنوں کو خبر بھی نہ ہونے دی (بقول اس کے) بداعتمادی کی انتہا ہے......گویا

؎ مرے تھے جن کے لئے وہ رہے وضو
کرتے

مگر یہاں تو وضو کرنے میں مشغول رہنے کا بھی تکلف

نہ کیا گیا بلکہ صاف صاف اپنا مخالف سمجھا گیا، اب زرداری، گیلانی اوران کے سارے ہمنوا قوالی کرتے رہیں

دس اساں کیہہ پیار وچوں کھٹیا

امیر مینائی نے اس صورتحال کی منظرکشی یوں کی ہے

ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا
میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لئے

قارئین کرام! آنے والا مورخ جب اس دور کی تاریخ لکھے گا...... بے لاگ تاریخ......! تو پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے گا کہ نہ تو اس کے سامنے چیختے چنگاڑتے اینکر پرسن ہوں گے ...... نہ ہی قلم فروش صحافی ہوں گے ۔تب نہ کوئی امریکی محبت میں غلطان ملک ہوگا اور نہ کوئی حسین حقہ بھرنی ۔ نہ زرداری ...... نہ گیلانی بس حقائق ہوں گےاوراس کاقلم ہوگا۔صدق وایمان کی سیاہی سے بھرا ہواقلم ......ایبٹ آباد آپریشن کے بعد دشمن اب کھلم کھلا ......صاف صاف اور بار بار کہہ رہا ہے کہ ضرورت پڑنے پر آئندہ بھی اسی طرح کی کارروائی دہرائی جائے گی ۔ستم تو یہ ہے کہ ایک ہی دن کے ایک ہی اخبار میں پہلے صفحہ پر امریکی عزائم کی ایسی خبر لگی ہوئی ہے جبکہ دوسرے صفحہ پر حکومت کی وضاحت موجود ہوتی ہے جوصفحہ اوّل کی خبر کے بالکل متضاد ہوتی ہے۔ اسے کہتے ہیں جھوٹے دلاسے دیتے رہنا۔کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہماری حکومت اپنے وطن کا، اپنی قوم کا، مسلمانوں کا، امت مسلمہ کا سوچے ۔ہمارے خیال میں فیصلہ کن موڑ آچکا ہے دشمن کا ساتھ دے کر ذلت کی موت ...... منافقت اور غداری کی موت مرنا ہے؟ یا پھر سچ حق کا ساتھ دیتے ہوئے ......اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے غیرت مندانہ راستے پر چلنا ہے؟ اس شاہراہ پر چلتے ہوئے موت بھی آگئی تو وہ شہادت ہوگی ۔انفرادی اوراجتماعی توبہ استغفار کی بے حد ضرورت ہے ۔ اللہ تعالیٰ رحم فرما دے، فضل فرما دے، کرم فرمادے۔آمین

خبریں تو بہت ساری تھیں مگر ایبٹ آباد آپریشن کی خبر ہی سب پر حاوی ہوگئی ۔ایک شعر سناتے ہوئے اب آپ سے اجازت چاہیں گے۔

جئیں تو غازی جو مر جائیں تو شہید سحؔر
ہمیں قبول نہیں کوئی درمیان کی بات

میری لائبریری سے

نام کتاب: ہمارے والدین، شجر ہائے سایہ دار

مصنفہ: سیدہ حمیرا مودودی

پبلشر: منشورات منصورہ ملتان روڈ لاہور 04235434909

سکہ رائج الوقت یہ ہے کہ افسانہ ہو یا مضمون پہلے قسط وار چھپتا ہے اس کے بعد کتابی شکل میں۔ مجھے اگر یہ موقع دیا جائے کہ وہ کون سی کتاب ہے جس کو آپ پڑھنے کے بعد قسطوں میں بھی دیکھنا چاہیں گی؟ آنکھیں بند کر کے ایک دفعہ نہیں دس دفعہ میرا جواب یہی ہوگا؟ ''ہمارے والدین، شجر ہائے سایہ دار......'' ویسے تو سب والدین ہی شجر سایہ دار ہوتے ہیں لیکن یہ کون سے والدین ہیں جو اس کتاب کے ذریعہ ہی نہیں اپنی خدمات کے لئے ہمیشہ زندہ رہیں گے......؟؟ یہ کون سی معتبر ہستیاں ہیں کہ تینوں کی تینوں (ماں، بیٹا، بہو) ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں ایک قابل رشک ہے تو دوسری ہستی قابل تکریم...... یہ سید ابوالاعلی مودودی، ان کی والدہ محترمہ اور ان کی بیوی محمودہ بیگم ہیں...... ان کے کردار کی تابناکی اس کتاب میں نگاہوں کو خیرہ کئے دیتی ہے......عقل حیران اور زبان اس بات پر شکر کرتی ہے کہ اللہ نے ہمارے لئے مثالی شخصیات کا دور چنا جن کی فکر، سوچ اور سیرت پر ایک عالم رشک کرتا ہے آیئے اب کتاب سے چند پیرا گراف پڑھتے ہیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی کس خاندان کے چشم و چراغ تھے؟ سیدہ حمیرا موجودی کے الفاظ میں۔

''والد محترم، اہل بیت سے نسبت رکھنے والے خاندان کے چشم و چراغ تھے جس نے پہلے ہرات کی طرف اور پھر اپنے جد امجد قطب الدین مودود چشتی کے زمانے میں ہندوستان کی طرف ہجرت کی۔ سید قطب الدین سلسلہ چشتیہ کے سب سے بڑے بزرگ تھے ابا جان کی ولادت اورنگ آباد میں ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ میں ہوئی۔ ان کی شخصیت پر ہمارے دادا ابا کی تربیت کا گہرا اثر تھا وہ اپنے کم سن بچے کو اپنے ساتھ مسجد لے جاتے اور اپنے ہم عصر علماء وفضلا کی مجالس میں بٹھاتے تھے۔ قرآن مجید کی سورتیں یاد کراتے۔

دادا ابا جان کو راتوں میں انبیاء علیہ السلام کے واقعات بزرگان دین کے حالات اور اسلامی تاریخ کی کہانیاں سناتے اسلامی عقائد ذہن نشین کراتے اور ان پر دینی رنگ چڑھانے کی کوشش کرتے عام نشست و برخاست میں بھی اخلاق وتہذیب کی اصلاح کا ہمیشہ خیال غالب رہتا۔

ابا جان نے اپنے ایک استاد مولانا عبدالسلام نیازی کے بارے میں بتایا کہ میرے بچپن ہی میں والد صاحب نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اسے عربی پڑھانا ہے۔

چنانچہ بچپن میں بھی ان سے پڑھا تھا جب والد مرحوم نے دبی زبان سے پوچھا آپ پڑھانے کا کیا معاوضہ لیں گے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ میں علم بیچتا نہیں ہوں...... تقریباً اسی زمانے میں دہلی کے ایک کرخندار نے بھی مولانا عبدالسلام نیازی سے فرمائش کی آپ سب کو پڑھاتے ہیں مگر میرے بیٹوں کو نہیں پڑھاتے، اس پر مولانا نے جواب دیا ''کیا کروں تیرے لونڈوں کے سر میں بھیجا ہی نہیں ہے تو انہیں بھاڑے کے ٹٹوؤں (ٹیوشن پڑھانے والوں) سے پڑھا، میں انہیں نہیں پڑھا سکتا۔''

قلم ہاتھ میں لینے سے قبل پچیس سالہ ابوالاعلیٰ کا مشغلہ کیا تھا آیئے آج کے بیس پچیس سالہ نوجوان سے مقابلہ کرتے ہیں۔

''الجہاد فی الاسلام کی تصنیف سے پہلے وہ گیتا، رامائن، مہا بھارت وغیرہ کا مطالعہ کر چکے تھے۔ بائبل اور تالمود بھی باریک بینی سے پڑھ ڈالی تھیں۔ مولانا اشفاق کاندھلوی کے ہاں جامع ترمذی، موطا امام مالک کے درس کا سلسلہ بھی جاری تھا، ابا جان نے قرآن، حدیث، فقہی علوم تاریخ اسلام، سیاسیات، معاشیات اور عمرانیات جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا اور تصانیف کی کثرت کے باوجود معیار کو برقرار رکھا۔''

عظیم باپ کے بعد حمیرا مودودی اپنی ماں کا تعارف کیسے کراتی ہیں؟

''جب ہماری اماں جان (محمودہ بیگم) کی عمر تقریباً بارہ برس تھی انہوں نے ایک خواب دیکھا کہ میں نے ریت میں اپنا پاؤں رکھ کر اوپر سے ریت دبا دبا کر ایک گھروندا بنایا اور پاؤں باہر کھینچ کر اس گھروندے میں ہاتھ ڈالا تو بڑا چمکدار ہیرا میرے ہاتھ آیا۔ اس ہیرے پر نگاہیں نہیں ٹھہرتی تھی کہ اتنے میں چاروں طرف سے لوگ دوڑتے ہوئے آئے وہ کہہ رہے تھے، یہ ہیرا بہت قیمتی ہے تمہیں کہاں سے ملا ہے! ایک نے کہا اس نادر ہیرے کو سنبھال کر رکھنا کہیں کوئی اسے تم سے چھین نہ لے صبح ہوتے ہی یہ خواب اماں نے نانا جان کو سنایا وہ دہلی کے ایک جید عالم سے تعبیر پوچھنے چلے گئے انہوں نے کہا غالباً اس لڑکی کی شادی ایک بڑے عالم دین سے ہوگی جس کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلے گی۔''

قارئین! اب شادی کی تفصیلات ملاحظہ ہوں۔

''۱۵ مارچ ۱۹۳۷ء کو اماں جان کی شادی دہلی میں ابا جان سے ہوگئی، مہر کی رقم دو ہزار تھی ابا جان نے صاف کہہ دیا تھا، مہر ادا کرنے کے لیے ہوتا ہے اس لئے مقررہ مہر سے زیادہ ادا کرنے کی حیثیت نہیں رکھتا۔ بری میں ایک ساڑھی اور انگوٹھی آئی یہ اس زمانے کی بات ہے جب دہلی کے شرفاء میں سوا لاکھ سکہ رائج الوقت مہر لکھا جاتا تھا لیکن ادا کرنے کا کوئی رواج نہ تھا۔''

قارئین! بالعموم کالم کے اختتام پر یہ مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ کیا لکھوں اور کیا چھوڑوں لیکن یہ کتاب اپنے آغاز سے ہی اسی شش و پنج میں ڈال رہی ہے۔ دارالسلام کا تعارف کراؤں یا وہاں کے باشندوں کا! قیام پاکستان میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمات کا تذکرہ کروں یا ہجرت کے ان المناک واقعات کا جو آج بھی رونگٹے کھڑے کر دیتے ہیں؟ ان سب کو عبور کر کے آگے بڑھنا بہت مشکل مرحلہ ہے جو میں تنگی داماں کے باعث کر رہی ہو...... چلیے

آگے بڑھتے ہیں اس عظیم خاتون سے ملاقات کرتے ہیں جن کی کوکھ سے سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جنم لیا۔

''ہماری دادی اماں بڑی حوصلے والی خاتون تھیں وہ ہماری اماں جان کو نصیحت کیا کرتی تھیں بچوں کو ایسی عادت ڈالو کہ سرد اور گرم ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کر سکیں ایک وقت سونے کا نوالہ کھلاؤ موتی کوٹ کر کھلاؤ لیکن دوسرے وقت دال روٹی اور چینی سے کھلاؤ۔ نہ بچوں کی منہ مانگی مراد ہر وقت پوری کرو ماں باپ تو آسانی سے اولاد کی عادتیں خراب کر دیتے ہیں لیکن دنیا کوئی لحاظ نہیں کرتی یہ بڑے بڑوں کو سیدھا کر دیتی ہے اور پھر کہتی تھیں ''میں نے اپنے بچوں کو اسی طرح پالا ہے ایک وقت اچھے سے اچھا کھلایا تو دوسرے وقت دال چینی سے روٹی کھلائی۔'' شاید یہی وجہ تھی کہ ہمارے ابا جان ہر طرح کے سرد و گرم حالات، بڑی ثابت قدمی کے ساتھ گذار گئے اور ہر سختی اپنی جان پر جھیل گئے وہ فولادی اعصاب کے مالک تھے ٹوٹا بٹن خود ٹانک لیتے پھٹا کرتا خود سی لیتے پہلی گرفتاری کے بعد ان کی جیل کٹ (jail kit) ہر وقت تیار رہتی اس میں سوئی دھاگہ، ہر سائز کے بٹن بھی ہوا کرتے تھے۔''

ہماری دادی اماں ایک ولی اللہ خاتون تھیں وہ جب بیمار ہوتیں تو آسمان کی طرف نظریں اٹھاتیں اور جذبے کے ساتھ دعا اور التجا کرتے ہوئے کہتی تھیں ''من مریضم تو طبیبیم ...... اور پھر ٹھیک ہو جاتیں زندگی بھر ڈاکٹر کو نہیں دکھایا اور نہ کبھی دوا پی اگر کبھی پھوڑا پھنسی نکل آتا تو اس جگہ پر ہاتھ رکھ کر کہتی تھیں ''اے دنبل، بزرگ مشو، خدائے ما بزرگ است، (اے پھوڑے زیادہ نہ بڑھ ہمارا رب سب سے بڑا ہے، اور یہ کہنے سے پھوڑا ٹھیک ہو جاتا۔ وہ فارسی زبان وادب کی بہت بڑی سکالر تھیں اور اکثر بات کا جواب فارسی اشعار میں دیا کرتی تھیں۔

قارئین اس عظیم خاتون کے بہت سے ایمان افروز واقعات کتاب میں موجود ہیں بس ایک جھلک اور

''اماں جان کہتی تھیں، میں نے اپنی پوری زندگی میں تمہاری دادی اماں جیسی کوئی دوسری عورت نہیں دیکھتی جس میں سرے سے نفس ہی نہ ہو وہ کسی چیز کی طلب نہیں کرتی تھیں۔ دادی اماں کہا کرتی تھیں صوفیاء کی یہ صفت ہے کہ وہ کسی کو منع نہیں کرتے طمع نہیں کرتے اور جمع نہیں کرتے ......

اتفاق سے یہ تینوں صفات ہماری دادی اماں، اماں جان اور ابا جان میں موجود تھیں۔ رضا برقضا اور صبر جیسی اعلیٰ صفات کی ان تینوں ہستیوں نے اپنے اندر اس طرح سے پرورش کی تھی کہ وہ نفس مطمئنہ کا بہترین نمونہ بن گئے۔ اماں جان یہ ذکر کرتی تھیں کہ میں نے جینے کا سلیقہ تمہاری اماں جان سے سیکھا ہے حیرت کی بات ہے کہ ساس بہو دونوں ہمیشہ ایک رائے رکھتی تھیں اور کبھی آپس میں اختلاف نہیں ہوتا تھا۔

کتاب میں مولانا کی گرفتاری، پھانسی کی سزا ملک بلکہ پوری دنیا میں اس سزا کے خلاف ردعمل کی تفصیل موجود ہے۔ باپ جیل میں تھا تو بچوں کی پرورش کیسے ہوئی؟...... اماں جان اور دادی اماں کی یہ پوری کوشش ہوتی تھی کہ بچے خوش و خرم رہیں اور ان کی نفسیات پر برا اثر نہ پڑے۔ اماں جان کہتی تھیں انسان کا بچپن خوشیوں سے بھرپور ہونا چاہیے اور

اسے کبھی عدم تحفظ کا احساس نہ ہو کیونکہ کسی قسم کی محرومی اگر بچپن میں انسان کو ڈس لے تو اس کی شخصیت کو گہنا دیتی ہے۔ یہ تلخ یادیں پھر ساری زندگی آسیب کی طرح اس کا پیچھا کرتی ہیں ہر بچے کو VVIP ہونے کا احساس ہونا چاہیے تاکہ اس میں خود اعتمادی پیدا ہو سکے...... انہیں یہ فکر کھائے جاتی تھی کہ میرے بچے بچپن ہی میں بوڑھے ہو گئے ہیں اور ان کا بچپنا چھن گیا ہے......

ایک روز ملتان جیل سے ابا جان کا پیغام آیا کہ ہر بچہ مجھے الگ الگ خط لکھے چنانچہ ہم سب نے انہیں الگ الگ خط لکھے پھر ان خطوں کے جواب میں ابا جان نے ہم سب کو اپنے ہاتھ سے علیحدہ علیحدہ خط لکھے اور ہم میں سے ہر ایک کو ایک ایک چھوٹی سی تھیلی بھیجی ابا جان کی نیلے رنگ کی ایک قمیض جو پرانی ہو چکی تھی اسے کاٹ کر انہوں نے خود سوئی دھاگے سے تھیلیاں سی کر تیار کی تھیں ان تھیلیوں میں چھلے ہوئے چلغوزے، بادام، کشمش، پستے اور اخروٹ بھرے ہوئے تھے ہر تھیلی کے اوپر آٹے کی لئی سے چسپاں کی ہوئی چٹ پر ہم میں سے ہر ایک کا نام لکھا ہوا تھا کسی پر نورِ نظر، کسی پر جانِ پدر، اور کسی پر جگر گوشہ لکھ کر بچے کا نام لکھا ہوا تھا۔

ان خطوں اور تھیلیوں میں کیا تھا کہ انہیں دیکھے بغیر دادی جان تو بے ساختہ بلک بلک کر رو پڑیں اماں جان کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ سارا دن خاموش رہیں۔ آنے والی یہ تھیلیاں زبان حال سے اس طرح بول رہی تھیں جیسے کوئی جیتا جاگتا انسان آپ بیتی سنا رہا ہو وہ جیل کی اُداسی، تنہائی، بچوں سے دوری، گھر کی یاد اور معلوم نہیں کیا کیا بیان کر رہی تھیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ ابا جان عزم و ارادے کا کوہ گراں تھے لیکن وہ تھیلیاں جن پر جانِ پدر، گوشہ جگر، نورِ نظر کی چٹیں لگی ہوئی تھیں یہ بتا رہی تھیں کہ ارادے اور عزم کے اس پہاڑ کے اندر دھڑکنے والا دل بھی ہے اور یہ اس دل کی مجسم دھڑکنیں ہیں۔ کتاب پڑھ کر صدق دل سے یقین ہو جاتا ہے کہ اللہ والوں کی ایک نظر میں بھی بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ جیل میں مشقتی کا کردار ایسا ہی جیتا جاگتا کردار ہے جو مولانا پر ایک نظر ڈالتا ہے اور دل و جان سے ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ بظاہر اے کلاس کے قیدیوں کا خدمت گار لیکن اللہ نے اسے محبت بھرا دل عطا کیا...... مشقتی کے کئی یادگار اور جاندار واقعات کتاب کی زینت ہیں۔

ہماری سیاست کے بہت سے واقعات ایسے ہیں جن سے عام شخص ناواقف ہیں کتاب میں ایسے ہی کئی واقعات کی نقاب کشائی بھی ہے مثلاً راولپنڈی سازش کیس کی تفصیلات

۔

''جیل کے واقعات بیان کرتے ہوئے ابا جان نے بتایا ایک روز دوپہر کے وقت اچانک میرے کوارٹر کی دیوار کی دوسری جانب سے آواز آئی'' جنرل صاحب کا کھانا پکڑلو ...... مشقتی نے جا کر آواز دی، کون ہے؟ تو دیوار کی دوسری طرف سے ایک چنگیر پر رومال میں لپٹی ہوئی روٹیوں کے اوپر سالن کا ڈونگا اور سلاد رکھی ہوئی پکڑائی گئی اور پھر فوراً ہی جنرل (ریٹائرڈ) محمد اکبر صاحب (راولپنڈی سازش کیس والے جن کا کوارٹر ابا جان کے کوارٹر کے ساتھ متصل تھا) دیوار پھاند کر میرے احاطے میں آ گئے اور کہا میں آپ کے

ساتھ کھانا کھاؤں گا کھانے کے بعد کافی دیر جنرل صاحب نے باتیں کیں اور کہا۔

''مولانا صاحب بس ایک آدھ دن کی دیر ہو گئی ابا جان نے کہا ''کس چیز میں دیر ہو گئی؟'' جنرل اکبر صاحب کہنے لگے، سری نگر فتح کرنے میں، ہم تو تقریباً وہاں پہنچ چکے تھے کہ ہماری جیتی ہوئی بازی مذاکرات کی میز پر ہار گئی اور ہمارا فتح کیا ہوا علاقہ جہاں ہم نے قدم قدم پر اپنا خون گرایا تھا واپس کرا دیا گیا۔ پھر مبینہ راولپنڈی سازش کیس کے بارے میں جنرل صاحب کہنے لگے یہ سازش تو خود ہمارے خلاف بلکہ پاکستان اور پاکستانی قوم کے خلاف کی گئی تھی انگریز افسروں نے جاتے وقت ان سارے باصلاحیت لوگوں کی فہرستیں تیار کیں جو لڑنے مرنے والے تھے اور جن میں کچھ کر گزرنے کا جذبہ تھا انہوں نے وہ فہرستیں ہماری حکومت کے حوالے کر دیں اور انہی میں سے اکثر افسروں کو پنڈی سازش میں دھر لیا گیا تاکہ جو شرابی، جوئے باز اور جونیئر افسروں کی بیویوں پر نظر رکھنے والے افسر ہیں وہی سنیارٹی پر ترقی پائیں اور ملک وقوم پر خوب ہاتھ صاف کریں ...... جنرل صاحب دل کا بوجھ ہلکا کر کے اسی طرح دیوار پھاند کر اپنے احاطے میں چلے گئے......

سیدہ حمیرا مودودی اصلی نسلی سیدوں کی صفات اپنی دادی اماں کی زبانی بیان کرتی ہیں ......''جب کوئی تم سے کہے کہ میں سید ہوں تو اسے سات چیزوں میں پرکھو۔

۱۔سید کو طیش نہیں آتا اور آتا ہے تو صرف دین کے معاملہ میں۔

۲۔سید کبھی بھی ذاتی انتقام نہیں لیتا۔

۳۔سید کبھی گالی کے جواب میں گالی نہیں دیتا۔

۴۔سید کسی کے لئے دل میں کینہ نہیں رکھتا اور غیبت نہیں کرتا۔

۵۔سید کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

۶۔سید کبھی کھانے میں عیب نہیں نکالتا بھوک اور پیاس سے کبھی بے حال نہیں ہوتا جو سامنے آئے صبر سے کھا کر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔

۷۔سید پر زندگی میں کبھی کبھی سخت مقام ضرور آتا ہے اور اس کی جان تک خطرے میں ہوتی ہے لیکن وہ ہمت نہیں ہارتا اللہ کے بھروسے پر ہر خطرے سے لڑ جاتا ہے اور بدترین حالات سے ٹکرا لیتا ہے۔''

مصنفہ لکھتی ہیں ابا جان نے گالی کے جواب میں گالی تو دور کی بات ہے پلٹ کر کبھی سخت لفظ نہیں کہا مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ ہمارے بچپن میں ابا جان اچھرہ کی ایک مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد گھر واپس آئے امام مسجد ابا جان کے مخالف تھے انہوں نے اپنے سامنے بیٹھے ہمارے ابا جانے کے خلاف سارا خطبہ جمعہ دے ڈالا اور آخر میں تان اس انوکھی منطق پر توڑی کہ اگر کوئی ''مودودیا، مر جائے اور اس کی قبر پر بیری کا درخت اُگ آئے اس بیری کے پتے کھا کر اگر کوئی بکری دودھ دے تو سنو وہ دودھ پینا بھی حرام ہے۔'' ابا جان کے ساتھ جو بھائی نماز جمعہ پڑھنے گئے تھے واپس آ کر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے اور ہمیں یہ خطبے کا قصہ سنا رہے تھے لیکن ابا جان انتہائی سنجیدگی سے بلکہ حیران

ہوکر ہماری طرف دیکھ رہے تھے بھلا یہ بھی کوئی ہنسنے والی بات ہے ۔ کسی بھی حق گو انسان کو قارئین دھمکیوں کے بعد ، مراعات کا لالچ ،حکمرانوں کا شیوہ رہا ہے۔اس سلسلہ میں ابو الاعلیٰ مودودی کا کردار۔

''فیلڈ مارشل ایوب خان سے ابا جان کی بڑی یادگار گفتگو ہوئی یہ ملاقات لاہور میں ہوئی تھی اور گورنر مغربی پاکستان امیر محمد خان آف کالا باغ بھی اس موقع پر موجود تھے ۔ایوب خان نے فرمایا مولانا سیاست ایک گندا کھیل ہے آپ جیسے عالم شخص کو اس میں نہیں آنا چاہیے۔

ابا جان نے جواب دیا تو آپ کا کیا خیال ہے اسے گندا ہی رہنا چاہیے اس میں گندے لوگوں کی بجائے صاف ستھرے کردار کے لوگ آئیں گے تبھی تو یہ گندگی صاف ہو گی ۔

اس کے بعد ایوب صاحب نے کہا، آپ اپنے بچوں کے نام سے فیکٹریاں لگا ئیے ہم آپ کو بنکوں سے قرضے، پرمٹ اور لائسنس دیں گے جس عرب ملک میں آپ چاہیں گے ہم آپ کو سفیر بنا کر بھیجیں گے پھر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کا وائس چانسلر بننے کی بھی پیشکش کر دی مگر ان تمام پیش کشوں کے جواب میں ادھر ایک شان استغناء تھی اور بس! ابا جان نے صرف یہ کہا۔

''آپ نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہے۔''

کتاب میں حمیرا مودودی نے بہت جگہوں پر ان تلخ تجربات کا ذکر کیا ہے جو انہیں اپنی زندگی میں باپ کی حق گوئی کی وجہ سے برداشت کرنا پڑے ۔ بہت دفعہ آنکھیں بھیگ گئیں ۔ ایسے لرزا دینے والے احساسات جو انسان کی توقع میں بھی نہیں ......اگر کتاب میں مولانا کے ساتھیوں کی جانثاری کے قصے موجود ہیں تو کتاب میں ایسے واقعات بھی ہیں جو ملازموں کی شکل میں مخبروں کی مخبری کے ہیں ...... بالخصوص ایک واقعہ تو دل دہلا دینے والا ہے ۔ چونکہ یہ کالم ان صفحات کا متحمل نہیں ہوسکتا...... اس لیے چلتے چلتے اب ایک آدھ کرداروں سے مزید ملتے ہیں ۔

''شاہ فیصل مرحوم کو ابا جان نے ایک اور اہم مشورہ بھی دیا تھا یہی سوچتی ہوں کہ اگر شاہ فیصل اس پر عمل کر لیتے تو آج عالم اسلام کے حالات کچھ مختلف ہوتے ۔ ابا جان نے شاہ فیصل سے بالمشافہ گفتگو میں کہا تھا جس طرح امریکہ نے ڈالر کے بل پر ساری دنیا کے اعلیٰ دماغ کھینچ کر اپنے ملک میں جمع کر لیے ہیں اس طرح وہ ملک جو صرف پانچ سو برس پہلے دریافت ہوا تھا اسے بے مثال ترقی دی ہے اسی طرح آپ ریال کے بل پر جن کی آپ کے پاس کوئی کمی نہیں ہے اور نہ ہی رقبے کی آپ کے ملک میں کمی ہے آپ عالم اسلام کے اعلیٰ ترین دماغ کھینچ کر اپنے ملک میں جمع کر سکتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ان عالی دماغ ڈاکٹروں ، سائنسدانوں ، ماہرین سماجی علوم اور بلند پایہ محققین کو آپ سعودی عرب کی شہریت اور بنیادی حقوق بھی دیجئے ۔ پھر آپ دیکھئے گا کہ سعودی عرب کو سماجی ،علمی ، صنعتی ، دفاعی میدانوں میں کس قدر عروج نصیب ہوتا ہے اور یہ عروج صرف سعودی عرب کا عروج نہیں پورے عالم اسلام کا عروج ہوگا۔ جواب میں شاہ فیصل نے فرمایا ، میں ریال کے بل پر سارے عالم اسلام

کے بہترین دماغ تو سعودی عرب میں جمع کر لوں گا انہیں شہریت اور حقوق بھی عطا کر دوں گا لیکن میرے ہم وطن بدو بکریاں لےکر اور اونٹوں پر سوار ہو کر واپس خیموں میں چلے جائیں گے اور صحراؤں میں ایسے گم ہوں گے کہ ان کا نشان بھی نہیں ملے گا۔

صاحب تفہیم القرآن ایک معبّر بھی تھے۔ کتاب میں سرگودھا کے اس نوجوان ہوا باز کا خواب جو دل چیر کر رکھ دیتا ہے۔ وہ خواب یہ ہے کہ میں مدینہ گیا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بج چکی ہے پورا مدینہ بم باری سے تباہ ہو چکا ہے نہ مسجد ہے نہ گنبد خضرا نہ کوئی گھر اور عمارت سلامت ہے جب میں اس مقام پر آتا ہوں جہاں روضۂ مبارک ہے تو دیکھتا ہوں نبی اکرمؐ کچی قبر سے باہر کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں کبھی قریب ہی سے بہت سے لوگوں کی آوازیں آتی ہیں میں ادھر دیکھتا ہوں تو ایک تہہ خانے میں سیڑھیاں اترتی نظر آتی ہیں میں فوراً نیچے تہہ خانے میں چلا جاتا ہوں ابھی آدھی سیڑھیاں ہی اترا تھا کہ دیکھتا ہوں چھ سات یہودی صرف جانگیے پہنے بڑے بڑے چھرے ہاتھ میں لئے انسانی لاشوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ڈھیر لگا رہے ہیں اور دیواروں کے ساتھ (اہل مدینہ) کی بے شمار انسانی لاشیں لٹکی ہوئی ہیں میں یہ منظر دیکھ کر فوراً الٹے پاؤں اوپر کی طرف بھاگتا ہوں یہ تو میرے بھی ٹکڑے کر ڈالیں گے اوپر پہنچ کر دیکھتا ہوں آپؐ التحیات پڑھ کر سلام پھیر رہے ہیں سلام پھیر کر میری طرف دیکھ کر آپؐ فرماتے ہیں ''فکر نہ کرو یہ گوشت بکے گا نہیں! اور پھر فوراً ہی میری آنکھ کھل گئی۔''

اس خواب کی تعبیر اور پھر مولانا اور ان کی بیگم کے دم واپسیں کے لمحات کس قدر قابل رشک تھے...... یہ اس کالم کی اگلی قسط میں نہیں، اپنی کتاب میں پڑھیے...... بالخصوص اماں جان کا آخری دنوں میں مکہ اور مدینہ میں قیام، رب سے تعلق اور قربت کی داستان......

بلا شبہ یہ یادیں سیدہ حمیرا مودودی کے پاس امانت تھیں جو اس کتاب کی شکل میں لوٹا کر انہوں نے احسان کیا ہے شکریہ سیدہ حمیرا! شکریہ منشورات! اللہ حافظ

۞ ۞ ۞

خواب سے حقیقت تک

کئی روز سے میں اور میرے شوہر سیر سپاٹے کے موزوں مقام کے لئے باہم مشاورت میں مصروف تھے۔ آصف اسلامی اقتصادیات میں انگلستان کی ایک یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔ ہماری ازدواجی زندگی کو ماشاء اللہ ایک برس بیتنے کو تھا اور ہم شادی کی سالگرہ کو بدرجہ اتم یادگار بنانے کا عزم رکھتے تھے۔ کافی دنوں کے غور و خوص کے بعد ہم دونوں لندن کی سیر کو آمادہ ہوئے۔ مجھے انگلینڈ کی سرزمین پر قدم رکھے ہوئے تقریباً چھ ماہ گزر چکے تھے تاہم ابھی تک لندن کو ہماری گاڑی سے اڑتی گرد اور ہمارے قہقہے سننے کا موقع یکسر میسر نہ آسکا تھا۔ آجکل میں اور آصف بریڈ فورڈ میں مقیم ہیں جو لندن سے کم و بیش ۵ گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے۔

غرض جب ہم دونوں نے اپنے اپنے ووٹ لندن کے حق میں ڈال دیئے تو وہاں رہائش کے لئے ہوٹل، طعام کے لئے ریسٹورنٹ اور تفریح کے لئے مقامات کی فہرست بنانے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی۔ یہ تلاش قیام و طعام بمعہ تفریحی مقامات مجھ ناچیز کو انٹرنیٹ کے وسیع جہاں کے ذریعے کرنا تھی۔ گھر کے کام کاج سے فراغت کے بعد میں تقریباً روزیا کئی مرتبہ دن میں دو دو تین تین بار اس انٹرنیٹ کی سرزمین میں اپنے گھوڑے دوڑاتی۔ کئی مرتبہ جب مرضی کے مطابق کوئی چیز نظر آتی تو اس کو کمپیوٹر میں ہی محفوظ کر لیتی تا کہ آصف کو دکھا کر حتمی فیصلے پر پہنچا جا سکے۔ یہ کام کم و بیش ہفتے بھر جاری رہا اور بالآخر لندن میں ہوٹل کی معلومات اور تفریحی مقامات کی جگہیں بھی باہمی مشاورت سے طے پا گئیں۔

ایک روز آصف نے مجھے اسکاٹ لینڈ کے دارالحکومت ایڈنبرا سے بریڈ فورڈ اور گلاسگو سے بریڈ فورڈ کی درمیانی مسافت انٹرنیٹ سے معلوم کرنے کو کہا اسکاٹ لینڈ چونکہ دوسرا ملک ہے تو یوں سمجھئے کہ اس کے ذکر نے ہی لندن کے سفر پر غلبہ حاصل کر لیا۔ میں نے اسی روز جب فاصلہ دیکھا تو دونوں کا فاصلہ لندن کے فاصلے سے قدرے کم نکلا۔ اب تو جیسے اسکاٹ لینڈ مجھے اور آصف کو شادی کی سالگرہ منانے کیلئے اپنی طرف کھینچنے لگا اور ہم بھی خوشی خوشی کھنچتے رہے۔

ایک بار پھر میں اور میرا کمپیوٹر ایک دوسرے کے روبرو موجود تھے اور میں پھر گھوڑے کی باگیں تھامے لاتعداد ویب سائٹس کی سیر کرنے میں مشغول ہوگئی۔ آصف کو قبل از شادی یورپ کے ویزے کے حصول کے لئے ایڈنبرا بذریعہ ٹرین جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ انہوں نے نہ صرف ایڈنبرا کو سرسری طور پر دیکھا ہوا تھا بلکہ وہاں کے تاریخی قلعے کے بارے میں بھی سن رکھا تھا۔ چنانچہ عالمی سرچ انجن گوگل کی مدد سے

ہم نے اسکاٹ لینڈ کے دو مشہور شہروں ایڈنبرا اور گلاسگو کی خوبصورتی کا تصویری موازنہ کیا ۔ دونوں ہی شہر اپنی مثال آپ تھے مگر ایڈنبرا ساحلِ سمندر پر ہونے کی وجہ سے گلاسگو پر بازی لے گیا۔ جن دنوں آصف ایڈنبرا گئے تھے وہ ماہِ دسمبر تھا جس کی وجہ سے راستے میں موجود پہاڑی سلسلے اور چوٹیاں ، میدان اور بلند و بالا عمارتیں غرضیکہ ہر چیز برف کی سفید چادر اوڑھے ہوئے تھی ۔ دوسری وجہ انتخاب بلا شک وشبہ گلاسگو کے مقابلے میں ایڈنبرا اور بریڈ فورڈ کی درمیانی مسافت کا کم ہونا تھا۔ شہر کے انتخاب کے بعد اگلہ مرحلہ قیام و طعام اور تفریح کے مراکز کی تلاش تھی ۔ اس لئے میں نے جو تلاش لندن کے مقامات کے ضمن میں کی تھی اس تلاش کو اب ایڈنبرا کے حوالے سے کرنے کا آغاز کر دیا۔

چلئے پہلے بات کرتے ہیں مراکزِ قیام کے بارے میں ۔ انٹرنیٹ پر با آسانی ایسی بے شمار ویب سائٹس مل جاتی ہیں جہاں قیمت ، شہر کے خاص حصے ، ایک تا پانچ ستاروں وغیرہ کے لحاظ سے ہوٹلوں کی لسٹ کھل جاتی ہے ۔ نہ صرف اس ہوٹل کے بارے میں بنیادی معلومات موجود ہوتی ہیں بلکہ وہاں رہنے والوں کے لئے دیگر سہولیات اور جو وہاں رہ چکے ہوتے ہیں ان کے تبصرے بھی موجود ہوتے ہیں ۔ تصویری البم بھی ہوٹل کی خوبصورتی ، جدت اور صفائی کے بارے میں واضح آگاہی دینے میں مدد کرتی ہے ۔ کئی مرتبہ ہوٹل کی تصویر کشی انتہائی خوبصورتی سے کئی گئی ہوتی ہے اور اس کی قیمت بھی انتہائی مناسب ہوتی ہے مگر وہاں رہ کر آزما لینے والے ان کے کسٹمرز کی آراء آپ کی رائے پر بھی با آسانی اثر انداز ہو جاتی ہیں ۔ کئی ہوٹلوں کی خصوصیات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بالآخر میں نے دو تین ہوٹل منتخب کئے جو ہر لحاظ سے بہترین تھے ۔ ان کی سرسری معلومات میں نے کمپیوٹر میں محفوظ کر لیں ۔ اب اگلا مرحلہ حلال ریستوران کا انتخاب تھا جو بڑی آسانی سے مکمل ہو گیا۔ میں نے دو take aways کی تفصیلات محفوظ کر لیں ۔

اگلا کام تفریحی مقامات کی نشاندہی بمعہ تفصیلات ڈھونڈنا تھا۔ ہم نے ایڈنبرا میں ایک رات قیام کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا جس کو اگر مدِ نظر رکھا جاتا تو ہمارے پاس دو تین مقامات کی سیر سے زیادہ وقت نہ تھا ۔ میں نے ایڈنبرا کے قلعے ، شاہی باغ اور کریمنڈ ساحل کا انتخاب کیا اور اس کی ساری تفصیلات نوٹ کر لیں ۔ اب آصف کو اور ان تفصیلات کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے لانا رہ گیا تھا تاکہ حتمی تفصیلات کو کاغذ پر لکھ لیا جائے اور دورانِ سفر اپنے ساتھ لے جایا جائے ۔ انہوں نے تینوں ہوٹلوں میں سے The point Hotel کا انتخاب کیا کیونکہ وہ ہر لحاظ سے ہماری توقعات پر پورا اترتا تھا۔ ریستوران کے لئے ''کباب محل'' کو چُنا گیا کیونکہ ان کی ویب سائٹ پر موجود مینیو میں کافی ورائٹی تھی اور سب کچھ حلال تھا ۔ میرے منتخب کئے ہوئے تینوں تفریحی مقامات ان کو پسند آ گئے ۔ اب تمام معلومات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر لیا گیا اور اس کے ساتھ انہوں نے ہوٹل کی آن لائن بکنگ بھی کروا دی ۔ تحریری کام مکمل ہو چکا تھا جبکہ صرف ایڈنبرا کی سیر کے لئے جانے کا انتظار دن بدن زور پکڑتا جا رہا تھا۔

ایڈنبرا

ایڈنبرا اسکاٹ لینڈ کا دارالحکومت اور دوسرا بڑا شہر ہونے کے ساتھ ساتھ مملکت متحدہ (United Kingdom) کا ساتواں گنجان آباد شہر بھی ہے ۔ ایڈنبرا اسکاٹ لینڈ کے جنوب مشرقی حصے میں واقع ہے ۔ اس کا مشرقی ساحل شمالی سمندر کے بے انتہا قریب ہونے کی وجہ سے ٹھنڈی یخ ہواؤں کے زیراثر رہتا ہے۔

ایڈنبرا کی تاریخ کے مطابق یہاں پر لوگ تانبے کے دور میں رہائش پذیر ہوئے ۔ ۱۶۰۳ء میں شاہ جیمز چہارم نے عنانِ اقتدار سنبھالی تو تمام بادشاہوں کو یکجا کر کے ''متحدہ بادشاہت'' کا نام دیا ۔ اس نے اسکاٹ لینڈ کے حکومتی ایوان کو ایڈنبرا میں قائم کیا اور اسکاٹ لینڈ ایک آزاد ریاست کے طور پر پہچانا جانے لگا ۔ شاہ جیمز چہارم نے اپنی بادشاہت کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے لندن میں قدم رکھا اور ایڈنبرا کی عوام سے وعدہ کیا کہ ہر تین سال بعد وہ ایڈنبرا کا دورہ کیا کرے گا مگر صرف ایک بار ۱۶۱۷ء میں ایڈنبرا آیا۔ تیسری برطانوی خانہ جنگی کے بعد دولتِ مشترکہ کی افواج نے ایڈنبرا پر قبضہ کر لیا۔ انیسویں صدی میں گلاسکو کی طرح یہاں بھی صنعتی انقلاب لایا گیا مگر وہ اتنی جلدی ترقی حاصل نہ کر پایا جتنی جلدی گلاسکو میں کر چکا تھا۔ ایڈنبرا آجکل ایک بنیادی ثقافتی مرکز سمجھا جاتا ہے اور بالعموم Athens of the north کے نام سے مشہور ہے۔

۲۰۱۰ء کی مردم شماری کے مطابق ایڈنبرا کی کل آبادی تقریباً ۵ لاکھ ہے جس میں گورے ۹.۹۵ فیصد اور ایشیائی افراد ۲.۶ فیصد جبکہ بلحاظ مذہب عیسائی ۸.۵۴ فیصد اور مسلمان ۵.۱ فیصد ہیں ۔ یہاں کا پسندیدہ کھیل فٹ بال، رگبی اور آئس ہاکی ہے جس کے لئے ان گنت کلب موجود ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ اسکاٹ لینڈ کی ٹیم بین الاقوامی سطح پر کرکٹ بھی کھیلتی ہے ۔ ایڈنبرا میں چار بڑی یونیورسٹیاں ہیں جہاں کم وبیش ایک لاکھ طلباء تعلیم حاصل کر رہے ہیں ۔ کرنسی کے اعتبار سے یہاں بھی انگلینڈ کی طرح پاؤنڈ ہی چلتے ہیں ۔

بالآخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور ۱۴ فروری بروز پیر کا سورج پوری آب وتاب کے ساتھ طلوع ہوا جس کی کرنیں پھیلتے ہی بادلوں کے پیرہن میں چھپ گئیں اور موسم بے انتہا خوشگوار ہو گیا ۔ نمازِ فجر سے فارغ ہو کر میں نے باورچی خانے کا رُخ کیا ۔ کپڑے استری کرنے کا کام تو گزشتہ روز ہی پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا تھا مگر بیگ میں ضروری سامان اور ساتھ لے جانے کے لئے اشیاء خوردونوش رکھنا باقی تھا ۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں اور آصف بیگ پیک کرنے میں مصروف ہو گئے ۔ ایک رات قیام ہونے کے باوجود اشیا کی تعداد دیکھ کر لگتا تھا جیسے قیام کی میعاد طویل ہے ۔ چونکہ آج ہماری شادی کی پہلی سالگرہ تھی چنانچہ انٹرنیٹ پر کئی مبارکباد کے پیغامات میری سہیلیوں اور بھائی کی جانب سے موصول ہوئے ۔ میری امی کا فون تو پچھلے روز ہی آ چکا تھا مگر ساس امی اور نندوں کے فون صبح صبح ہی آنے لگے ۔ سب سے بات کر کے ہم دونوں کی خوشیاں دوبالا ہو رہی تھیں ۔ آصف نے سامان گاڑی میں رکھا اور ہم نے علی الصبح اسکاٹ لینڈ کے لئے رختِ سفر باندھا۔

ہم موٹروے کی جانب گامزن تھے جو ہمارے اندازے کے مطابق کافی قریب تھی مگر nanigabam ہمیں کسی اور راستے سے لے کر جا رہی تھی جو واقعی حسن کا نمونہ تھا ۔ایک جانب پہاڑ اور دوسری جانب آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی سبز گھاس کی چادر اوڑھے ہوئے اللہ کی بنائی ہوئی زمین ۔تقریباً ۳۰ میل کا سفر ان بل کھاتے راستوں سے طے کرنے کے بعد ہم موٹرے پر پہنچے جہاں مزید ۱۱۰ میل کا سفر باقی تھا۔ راستے میں ہونے والی ہلکی بارش رفتہ رفتہ تیز ہوتی جا رہی تھی ۔ میں نے اپنے پرس میں بسکٹ اور چاکلیٹ رکھی ہوئی تھیں جن سے وقتاً فوقتاً لطف اندوز ہوتے ہوئے ہم ارد گرد کے موسم اور سبزے سے محظوظ ہو رہے تھے۔ دوران سفر بھی پاکستان سے کئی مبارکباد ٹیلیفون کالز موصول ہوئیں ۔ خدا خدا کرتے موٹروے سے ہماری گاڑی اتری اور حسین پہاڑوں کی وادی میں داخل ہوئی ۔ یہ کوئی ۴۰ میل کا سفر تھا۔ بل کھاتے راستے اور دیو قامت پہاڑ خدا کی قدرت کا نمونہ تھے ۔کہیں آدھا پہاڑ سبز اور آدھا بھورا تھا تو کہیں سفید ۔ ہر پہاڑ ہی انوکھا تھا ۔کہیں بادلوں نے پہاڑوں کی چوٹیوں کو چھپا رکھا تھا اور کہیں سورج بادلوں کی اوٹ سے جھانک کر نخلستان کا منظر پیش کر رہا تھا۔ سورج اور بادلوں کی آنکھ مچولی سے قوسِ قزح نے بھی آسمان پر ڈیرہ جما لیا تھا ۔ سڑک کا ہر موڑ موڑتے ہی پہاڑوں کی نئی دنیا نظر آتی اور ہم خوبصورتی کے سحر میں لحہ بہ لحہ مزید قید ہوتے چلے جاتے میرا کیمرہ مستقل تصویر کشی اور ویڈیو بنانے میں مصروف رہا ۔ کچھ ہی دیر بعد سڑک پہاڑوں کے اختتام پر سبزے کے درمیان سے گزرنے لگی اور ہم ایڈنبرا کے مضافات سے ہوتے ہوئے شہر کے مرکز میں داخل ہوئے ۔

ایڈنبرا کی عمارات پرانی طرز پر بنی ہوئی تھیں ۔ اونچے اونچے مینار کسی پرانی تہذیب کا پتہ دے رہے تھے ۔ شاید ان عمارتوں کو جدید بنیادوں پر اس لئے بھی دوبارہ تعمیر نہ کیا گیا تھا تاکہ ایڈنبرا کی ثقافتی شناخت کو برقرار رکھا جا سکے ۔ البتہ عمارتوں کے نیچے کھلی ہوئی جدید دکانیں ترقی یافتہ دور کی عکاسی کر رہی تھیں ۔ کئی جگہ سے سڑکیں غیر ہموار تھیں جیسے آپ سولھویں یا سترہویں صدی میں سفر کر رہے ہوں اور کہیں ہموار جیسے آجکل کے جدید ممالک میں ہوتی ہیں ہم The piont Hotel کے بیرونی حصے کو تصویروں میں دیکھ چکے تھے چنانچہ عمارت کو پہچانتے ہی سامان سمیت داخل ہو گئے چیک ان کے بعد ہم کمرے میں پہنچے تو گھڑی پر چار بج کر تیس منٹ تھے جتنی دیر آصف نے گاڑی کو پارکنگ میں لگایا، میں نے خود کو فریش کر لیا۔ ساڑھے چار سے پانچ گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم بہت تھک چکے تھے مگر چونکہ وقت کم تھا اور سیر گاہوں پر جانا بھی اہم تھا چنانچہ ہم نے پانچ بجے کے قریب گاڑی کا رُخ شاہی باغات (Royal gardens) کی جانب موڑا ۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ باغ بند ہونے والا ہے اور ہمارے پاس وقت تھوڑا ہے۔

شاہی باغات (Royal Gardens)

یہ باغات ۱۷۶۰ء میں اسکاٹ لینڈ کے پہلے باغ کے طور پر قائم کئے گئے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسکاٹ لینڈ میں خانہ جنگی پورے عروج پر تھی ۔ آج کل یہ باغ دنیا کا دوسرا بڑا

باغ تصور کیا جاتا ہے جہاں مختلف اقسام کے پودے موجود ہیں انیسویں صدی سے لوگ اس باغ کی مالی معاونت کر رہے تھے مگر اب اس کو Scottish governments Rural and environmental research and analysis(RERAD) نے سپانسر کر دیا ہے۔

یہ باغ پہلا عظیم سائنسی ادارہ تصور کیا جا سکتا ہے جہاں پودوں پر تحقیق کے ساتھ ساتھ ان کے تعلق، تشکیل، عملِ تحفظ اور حیاتیات کی وضاحت کی جاتی ہے۔ ۷۰ ایکڑ پر محیط یہ خوبصورت مناظر سے مزین شاہی باغ City center سے ایک میل کے فاصلے پر جنت کا نظارہ پیش کرتا ہے۔ چاہے کوئی حصولِ علم کے لئے یہاں آئے یا متجسس سیاح کے طور پر، اسے اس باغ میں اپنی قوتِ متخیلہ سے بڑھ کر حُسن نظر آتا ہے۔

یہ باغ ۲۵ دسمبر اور یکم جنوری کے علاوہ ہر رزوز سیاحوں کی آمد کے لئے کھلا رہتا ہے۔ نہ صرف آپ یہاں کے مناظر سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں بلکہ یہاں کھانے پینے کیلئے ریستوران اور کیفے بھی دستیاب ہیں۔ قریب ہی ایک دکان ہے جہاں سے آپ تحفے، کتابیں، یادگار، بیج اور باغبانی کے اوزار لے سکتے ہیں۔ یہاں تصویر کھینچنے کی مکمل آزادی ہے چنانچہ اپنا کیمرہ ساتھ رکھنا نہ بھولئے گا۔

ابھی ہم نے باغ کے کچھ ہی حصے کو دیکھا تھا کہ شام کے سائے اپنے پر پھیلانے لگے اور مجبوراً ہمیں واپسی کے لئے خود کو تیار کرنا پڑا۔ بھوک کافی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ کباب محل ریسٹورنٹ کا پتہ میرے پرس میں موجود تھا ہم باغ سے فارغ ہوتے ہی کباب محل کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں چکن جلفریزی کھا کر شادی کے ابتدائی دنوں کی یاد تازہ کی کیونکہ شادی کے بعد جس بھی ریستوران جاتے وہاں سے چکن جلفریزی کھانا نہ بھولتے اس کے بعد گلاب جامن اور رس ملائی کھائی اور بیرونِ ملک میں پاکستان کی یاد تازہ کی۔ کھانا کھا کر طبیت ہشاش بشاش محسوس ہو رہی تھی۔ مگر سفر کی تھکن اتارنا باقی تھا، اس لئے واپس ہوٹل کا رُخ کیا۔

میں نے سامان کو ترتیب دینا شروع کیا اور آصف کیمرے میں سے گزشتہ سیروں کی تصاویر نکالنے میں مصروف ہو گئے۔ ساتھ ساتھ ہم کل کی سیر کے منصوبے بھی بناتے رہے۔ اگلے روز ہمیں شاہی قلعے اور کریمنڈ ساحل پر جانا تھا۔

صبح ہوتے ہی ہم نے سامان سمیٹا اور چیک آؤٹ کرنے کے لئے تیار ہوئے۔ گھڑی ۱۱ بجا رہی تھی۔ میں Waiting lounge میں بیٹھی رہی اور آصف گاڑی لے کر آ گئے۔ سامان رکھ کر اب ہم شاہی قلعے کی جانب رواں تھے۔

شاہی قلعہ (Royal castle)

ایڈنبرا کا یہ مشہور قلعہ آتش فشاں چٹان پر تعمیر کیا گیا۔ یہ آتش فشاں آج سے ۳۵ ملین سال پہلے تک اپنا وجود رکھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ڈیوڈ اول کے دور میں یعنی بارہویں صدی سے یہ قلعہ یہاں موجود ہے، سترہویں صدی میں یہ قلعہ عسکری مرکز (War base) بنا دیا گیا۔ انیسویں صدی میں

اس قلعے کو تاریخی یادگار کا درجہ حاصل ہو گیا۔

عظیم ہال

اس ہال کی تعمیر ۱۵۱۱ء میں ہوئی جب ۱۲۵۰ء میں oliver cromwell نے اسکاٹ لینڈ پر فوج کشی کی تو اس نے اس عظیم ہال کو جنگی بیرک میں تبدیل کر دیا۔ ۱۸۸۰ء میں ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں اس کے شاہی حُسن کو بحال کیا گیا۔

تاج گاہ

یہ کمرہ شاہ جیمز چہارم کی قیمتی نشانیوں کی وجہ سے مشہور ہے جہاں اس کی ۵۰ سالہ بادشاہت کا جشن منایا گیا تھا۔ یہاں پڑا ہوا تاج اور تلوار سولھویں صدی میں شاہ جیمز چہارم کے استعمال میں رہی تھی۔ یہ تاج ۱۵۴۰ء میں ایڈنبرا کے Gold smith نے سونے کو پگھلا کر اور قیمتی جواہرات کو جوڑ کر بنایا تھا۔

شاہی ایوان

یہاں پر موجود کمرے کئی صدیوں تک شہزادیوں اور ملکہ کے زیرِ استعمال رہے۔ ملکہِ اسکاٹ کے اکلوتے بیٹے جیمز کی پیدائش اسی شاہی ایوان میں ہوئی جو بعد میں شاہ جیمز چہارم کے طور پر اسکاٹ لینڈ کا حکمران رہا۔ جس کمرے میں اس کی پیدائش ہوئی وہ بھی خوبصورتی سے سجایا گیا ہے۔

سینٹ مارگریٹ کا چھوٹا گرجا

مارگریٹ ۱۰۴۵ء میں برطانیہ کے شاہی خاندان میں پیدا ہوا۔ جب نورمان (سکینڈری نیویائی وفرنگی مخلوط نسل کا فرد جس نے ۱۰۲۲ء میں انگلستان فتح کیا) نے چڑھائی کی تو مارگریٹ اسکاٹ لینڈ روانہ ہو گیا جہاں اس نے ڈنفرملاٹن نامی لڑکی سے شادی کر لی۔ اس کا بھائی مالکولم ایک جنگجو تھا اور نورمان سے جنگ لڑ رہا تھا جبکہ مارگریٹ مذہبی ذہن رکھتا تھا۔ جب ۱۰۹۳ء میں اس کا بھائی مالکولم اور بھتیجا ایڈورڈ اس جنگ میں مارے گئے تو وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا اور اسی قلعے میں وفات پا گیا۔ یہ گرجا اس کے بڑے بیٹے شاہ ڈیوڈ اول نے بنوایا۔ نہ صرف یہاں عبادت کی جاتی تھی بلکہ یہ سولھویں صدی تا اٹھارویں صدی تک بارود کا گودام بھی رہا۔

جنگی قیدیوں کی نمائش گاہ

کئی صدیوں تک یہ قلعہ قید خانے کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ اس قید خانے میں قید بعض قیدیوں کو یہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ عام مجرموں کو قلعے کے نیچے تہہ خانہ میں قید کی سزا دی جاتی۔ ان قیدیوں میں دشمنوں کے فوجی ملاح، جاسوس، غدار اور ڈاکو وغیرہ شامل ہوتے۔ ان قیدیوں کو قلعے کی پہاڑی پر لوگوں کے سامنے پھانسی دی جاتی یا جلا دیا جاتا قیدیوں میں فرانسیسی، ڈچ، ہسپانوی، آئرلینڈ یا اٹلی کے باشندے، ڈینش، پولش اور امریکی لوگ شامل ہوتے۔ کچھ قیدی بہت تخلیقی ذہنیت رکھتے تھے جن کے بنائے ہوئے آرٹ کے نمونے ابھی بھی موجود ہیں۔

مونز میگ

یہ ۵۵۰ سال پرانی بندوق دنیا کے قدیم ترین اسلحے میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کا وزن ۶۰۰۰ کلوگرام ہے اور یہ دو میل کے فاصلے تک ۱۵۰ کلوگرام وزنی پتھر پھینکنے کی استعداد رکھتی ہے۔

ایک بجے کی بندوق

یہاں پرآنے والے سیاحوں کی توجہ کا مرکز بننے والی یہ بندوق ہر روز سوائے اتوار کے قلعہ کی شمالی دیوار سے گولا داغتی ہے۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ یہ کوئی خودکار بندوق ہے بلکہ یہاں پرموجود ایک قابل توپچی ہر روز 1 بجے یہ بندوق چلاتا ہے۔پہلی بار یہ بندوق ۷ جون ۱۸۶۱ء کو چلائی گئی تھی اورتب سے آج تک یہ روایت جاری ہے۔اس کا اصل مقصد اُس زمانے میں کشتیوں اور بحری جہازوں کو وقت کا سگنل دینا ہوتا تھا مگر آج کل یہ صرف ایک روایت کا روپ دھار چکی ہے۔ آصف نے بھی اس گن کے چلنے کے منظر کیکیمرے میں قلمبندی کی جو کہ ایک یادگار رہے۔

اسکاٹش جنگی قومی یادگار

یہ یادگار ۱۹۲۷ء میں پہلی جنگِ عظیم میں مارے جانے والے لوگوں کی یاد میں کھولی گئی۔ یہاں ان تمام لوگوں کے نام درج ہیں جواس جنگ میں انتقال کر گئے اور تصویروں کی مدد سے جنگی حالات کی عکس بندی کی گئی ہے۔اس یادگار کی سنگِ بنیاد شاہ ایڈورڈ نے ۱۴ جولائی ۱۹۲۷ء میں رکھی۔

ایڈنبرا کے خوبصورت نظارے

قلعہ کی چھت پر چڑھ کر آپ پورے ایڈنبرا کا نظارہ کر سکتے ہیں۔نہ صرف پورا شہر بلکہ جنوب کے طرف کی پہاڑیاں اور ایڈنبرا کے اردگرد پھیلا سمندر بھی اس نظارے کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

۲ بجے یہاں سے فارغ ہوکر ہم کریمنڈ ساحل کی طرف روانہ ہوئے۔اس ساحل تک آپ باآسانی گاڑی کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں پاس ہی بنی ہوئی پارکنگ میں آصف نے گاڑی پارک کی۔کھانے پینے کے لئے چپس، بسکٹ ، پانی، جوس وغیرہ ایک لفافے میں ڈال کر ہم سمندر کی طرف بڑھے۔میں نے زندگی میں پہلے کبھی ساحلِ سمندر نہ دیکھا تھا۔پہلا موقع ہونے کی وجہ سے میں بہت خوش تھی۔یہاں ایک کریمنڈ جزیرہ بھی موجود ہے جہاں جانے کا راستہ سمندر کے بیچوں بیچ بنائی گئی پگڈنڈی پر پیدل عبور کرنا پڑتا ہے۔ ساحل پر ٹھنڈی ہوا اتنی تیز چل رہی تھی کہ میرے اور آصف کے ہاتھ سن ہو رہے تھے۔اگرچہ میں نے جیکٹ پہن رکھی تھی اور گرم شال بھی مگر ہوا کے جھونکے ناقابلِ برداشت حد تک سرد تھے۔

ہم نے ہمت جمع کر کے پگڈنڈی پر قدم رکھے۔ دونوں جانب سمندر تھا اور ہم دونوں ہوا کے جھونکوں کا مقابلہ کرتے ہوئے دھیان دھیان سے قدم جما کر پگڈنڈی عبور کر رہے تھے۔جیسے جیسے ہم سمندر کے اندر جا رہے تھے ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی۔آصف نے مفلر اپنے کانوں پر لپیٹ لیا جبکہ میں نے شال اسکارف کے اوپر سر پر اوڑھ لی گو کہ ہمارا حلیہ مضحکہ خیز ہو گیا تھا مگر پھر بھی ہم سردی سے کانپتے ہوئے جزیرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ہم نے پڑھ رکھا تھا کہ کبھی کبھار جب لہریں اونچی ہو جاتی ہیں تو جزیرے پر گئے لوگوں کی واپسی ناممکن ہو جاتی ہے اور انہیں رات جزیرے پر گزارنا پڑتی ہے۔سمندر کے درمیان سنسان جزیرے پر رات گزارنے کا تصور ہی دل دہلا دینے کے لئے کافی تھا۔اگرچہ لہریں ابھی نیچے ہی تھیں مگر ہم نے مزید طبع آزمائی کرنے سے گریز کیا اور ویڈیو بنا کر واپس لوٹ آئے۔

کریمنڈ ساحل (Cramond Beach) شمال مغربی ایڈنبرا میں واقع ہے سٹی سنٹر سے پانچ میل کے فاصلے پر موجود یہ ساحل سیاحوں کو با آسانی اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت رکھتا ہے جس کی بنیادی وجہ سمندر کے درمیان رہ گزر اور جزیرہ ہے۔

واپسی کا سفر بے حد ضروری تھا کیونکہ رات کی تاریکی پھیلنے سے پہلے ہمیں ان پہاڑی راستوں کو عبور کرنا تھا جو موٹروے سے قبل آتے تھے۔ مگر بغیر کھائے پیئے نکلنے کی ہمت ہم دونوں میں نہ تھی۔ چنانچہ اب کی بار پھر کباب محل کا رُخ کیا۔چکن جلفریزی کو انجوائے کیا جو کہ واقعی یہاں بے حد مزے کی بنتی ہے۔

شام پانچ بجے کے قریب ہم نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ وہ پہاڑ جو دن کی روشنی میں جادوئی منظر پیش کر رہے تھے شام کے سائے ڈھلتے ہی طلسم زدہ ستونوں کی مانند دکھائی دینے لگے۔ رات کے وقت ٹریفک بھی کافی حد تک کم تھی۔ ہم آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے ان بل کھاتے راستوں سے گزر کر موٹروے تک پہنچے۔موٹروے کا سفر مناسب روشنی کے انتظام اور ٹریفک کی وجہ سے پُرسکون محسوس ہوا۔ اب کے دوبارہ ویران راستوں پر سے گزرنے کا وقت تھا۔ یہ میدان اور پہاڑ کا درمیان راستہ بے حد سنسان ہو چکا تھا مگر ہم اس پر قدرے حیران رہے کہ ویرانی کے اس عالم میں بھی لوگوں نے یہاں اپنے گھر بنا رکھے تھے یہ شہر روز جاتے ہیں! شاپنگ وغیرہ کا کیا کرتے ہیں؟ اتنی سنسان جگہ پر کیسے رہتے ہیں؟ ہم دونوں سوال و جواب میں مصروف تھے کہ ہمیں ایک سائن بورڈ پر بریڈفورڈ لکھا ہوا نظر آیا اور دل جلد از جلد گھر پہنچنے کو اور بھی بے قرار ہو گیا۔ جب گاڑی پارکنگ میں پارک ہوئی اور ہم سامان سمیت گھر میں داخل ہوئے تو جس دلی اطمانیت کا احساس ہوا اس کا اظہار لفظوں میں بیان کرنا بس سے باہر ہے۔

آتے ہی اٹیچی کیس کھول کر تمام چیزیں ان کے مقامات پر رکھیں۔ آدھی تھکن تو گھر میں قدم رکھتے ہی ہوا ہو گئی تھی۔ چیزیں سمیٹ کر اور نمازوں سے فارغ ہو کر ہم دونوں نے سکون کا سانس لیا۔ یہ سفر چاہے ایک رات اور دو دن کی مدت پر محیط تھا مگر واقعی یادگار تھا، جب سے ہم واپس آئے ہیں اکثر ہی اسکاٹ لینڈ کا یہ سفر یاد کرتے ہیں

کاش ممکن ہو کہ اِک کاغذی کشتی کی طرح
خود فراموشی کے دریا میں بہادیں یادیں

مگر شاید یہ وہ کشتی ہے جس نے ہمارے ساتھ کے اس حسین گلستان میں اک نئے پھول کا اضافہ کر دیا ہے جب بھی ہم کبھی اپنی یادوں کے باغ میں سیر کیا کریں گے یہ پھول ہمیں مزید تروتازہ کر دے گا۔

عالم اسلام اپنی اصل کی طرف لوٹ رہا ہے

نیویارک ٹائمز کے دونمائندے عراق کی فیشن ورلڈ کے بارے میں اپنے تاثرات لکھتے ہیں

مغرب کے پروردہ اوران کے غلام مسلم حکمرانوں نے ملت اسلامیہ کومغربی تہذیب، عریانیت اور جنسی بے راہ روی کی طرف ہنکانے کی پوری کوششیں کیں، اس سلسلے میں اپنا پورا زورصرف کیا خود امریکہ، یورپ اور دوسری صہیونی و صلیبی طاقتیں انسانیت کو عیش وعشرت، چمک دمک، جدیدیت اور ترقی پسندی کی چکا چوند کے ذریعے تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہی ہیں۔کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کررہی ہیں لیکن ایک طرف تو عالم اسلام کے عوام اپنی فطرت اور دین اسلام سے ٹوٹی پھوٹی لنگڑی لولی وابستگی کے طفیل ہی اس مصیبت سے بچنے کی کوشش کرتے رہے کہ وہ اس دوڑ میں پیچھے ہی رہے۔ کھینچ تان اور دھکا مکی سے بھی اس دوڑ میں شامل نہ ہوسکے۔دوسری طرف السعید من وعظ بغیرہ(خوش بخت وہ ہے جو دوسروں سے نصیحت حاصل کرلے) کے مصداق اس دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے والوں کی حالت زرارکودیکھ کرکانوں پر ہاتھ دھرنے پرمجبور ہوگئے۔افغانستان کے حوالے سے بار بار پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ وہاں کی خواتین،عوام اور علماء کو جال میں پھنسانے کی پوری پوری کوششیں کی جارہی ہیں، جہاں طالبان کی پیشانی پر قدامت پرستی کا داغ لگایا جاتا ہے امریکہ اوراس کے اتحادی مختلف جہتوں سے افغانیوں کو اس قدامت کے''چنگل'' سے نکال کر جدیدیت کے دائرے میں لانے پر اپنی تمام تر توانائیاں صرف کررہے ہیں لیکن افغانیوں کا قافلہ سخت جان ہے کہ وہ اس چکا چوند کے اثر اور جھانسے میں ہی نہیں آرہا ہے۔ جبکہ اہل عراق بھی جو بعث پارٹی اور صدام حسین کے خیالی و نظریاتی اڑن کھٹولوں پر سوار مغرب کی تقلید کو مقصد حیات بناتے نظر آرہے تھے، باخبر ذرائع کے مطابق اپنی اصل کی طرف تیزی سے لوٹ رہے ہیں۔

دی نیویارک ٹائمز (بحوالہ ایشین ایج ۲۶ فروری) کے مطابق بغداد میں فیشن وینڈر اور مغربی طرز کے شاپنگ مال بھی نہ صرف اپنے کاروبار خرید وفروخت، اشیائے تجارت میں اسلامی احکام وتعلیمات اور اصولوں کا پاس ولحاظ کرتے نظر آرہے ہیں بلکہ وہ فیشن ڈیزائننگ کی اشیائے فروخت کے ڈسپلے کے اوپر عربی میں وہ آیتیں اور احادیث منقش اور مجلی شکلوں میں آویزاں کررہے ہیں۔جن کو ہر پڑھا لکھا چھوٹا بڑا مرد، عوروت اور بچہ عراقی پوری طرح سمجھتا ہے اور اس کے مفہوم معنی ومطلب، حکم اور تقاضے پرتوجہ دیتا ہے۔

معاصر مذکور کے دونمائندوں جون لی لینڈ اور درید عدنان نے شمالی بغداد میں واقع خادمیہ مسجد کے گردونواح اور قرب و جوار کا دورہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ دکاندار جہاں خواتین کے ہرقسم کے لباس سر سے پیر تک پوری طرح لپیٹ لینے والی سیاہ عبا

سے لے کر رات کو استعمال ہونے والے معمولی قسم کے لباس تک فروخت کررہے ہیں اور فیشن ڈیزائن لباس کے مظاہرے کے لئے پورے قد کے انسانی مجسمے بھی کھڑے رکھتے ہیں، وہاں انہیں مغربی لباسوں میں بھی ملبوس کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی اسکارف اور عبا و برقع اور اسلامی تہذیب کی نمائندگی کرنے والے لباس بھی پہناتے ہیں اور ان کے آس پاس بینروں پر قرآن کی وہ آیتیں بھی آویزاں رکھتے ہیں جن میں نظریں نیچی رکھنے، زینت کو چھپانے، جلابیب، حجاب وغیرہ کی ہدایتیں دی گئی ہیں۔مغربی فیشن میں ملبوس خواتین کے مجسموں کے پیچھے لمبے چوڑے بینروں پر آوارہ اور لوفر قسم کے لڑکوں اور مردوں کو بھی دکھایا جاتا ہے کہ اس لباس کے نتیجے میں اس قسم کے انسانیت دشمن عناصر کو بیہودہ حرکتیں کرنے اور خواتین کے ساتھ بدتمیزی کرنے اور انہیں ستانے کا حوصلہ ملتا ہے کہیں یہ بھی لکھا ملتا ہے: ''جو اپنی آنکھوں کو ممنوعہ نظاروں سے لطف اندوز کرتا ہے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی آنکھوں کو جہنم کی آگ کی اذیت سے دو چار کر دے گا۔'' عراقی ان بینروں سے ملنے والے پیغامات کو اپنی زندگی کے لئے لازمی تصور کرتے ہیں۔مرد اپنی خواتین اور بچیوں کے ساتھ آتے ہیں۔انہیں پڑھتے ہیں۔وہ کہتے ہیں بازاروں اور نمائش گاہوں میں اکثر اللہ تعالیٰ کا خیال دل و دماغ سے نکل جاتا ہے لیکن یہ بینر اس کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔اہل مغرب اسے ترقی قرار دیتے ہیں لیکن ہم اسے بد اخلاقی، بدکرداری، بدچلنی اور فسق و فجور قرار دیتے ہیں۔عراق میں بعث پارٹی کے زمانے میں نظام حکومت ہی نہیں معاشرہ بھی دین و مذہب اور اسلامی تہذیب و اقدار سے بہت دور ہو گیا تھا، لیکن ۲۰۰۳ء میں صدام حسین کی حکومت کے خاتمے کے بعد سے باوجود یہ کہ امریکہ اور اس کے اتحادی اس کو اپنے پیچھے دوڑانے کی سرتوڑ کوششیں کررہے ہیں مگر اہل عراق کا طرز بود و باش، رہن سہن، خورد و نوش اور لباس اسلامی اقدار کی طرف لوٹنے کا پتہ دے رہے ہیں۔مرد ہوں کہ خواتین مغربی طرز معاشرت سے دوری اختیار کررہے ہیں اور شرعی تقاضوں کی طرف مائل ہورہے ہیں۔بچوں کو کمسنی سے ہی مغربی فیشن سے محفوظ رکھتے ہوئے ان کی تربیت کررہے ہیں۔خواتین برملا کہتی ہیں: ''یہی بہتر ہے۔اس میں عورتیں خود کو محفوظ محسوس کرتی ہیں یہ پیغامات، تحریریں اور بینر وغیرہ ہمیں غلط راستوں پر چلنے سے روکنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں کہ ہم دیکھیں ہم کیا کررہے ہیں، کیا پہن رہے ہیں'' کچھ لوگ ہیں کہ اللہ کا ڈر اور خوف ان کے دلوں میں نہیں پایا جاتا۔انہیں یہاں آکر یہ سب دیکھنا چاہیے، غیر مہذب لباس میں عورتوں کو دیکھ کر کچھ لوگوں کے دماغوں میں گندگی کی چنگاریاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔

(سہ روزہ ''دعوت'' دہلی۔10 مارچ 2011)

گھر ٹوٹنے نہ دینا

گھر اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی نعمت ہے جس کا کوئی بدل نہیں ۔عورت کی بہترین پناہ گاہ شوہر کی رفاقت اور بچوں کا وجود اللہ کا بہترین انعام ۔اللہ اوراس کے رسولؐ کی اطاعت کے بعد گھر شوہر اور بچے عورت کی پہلی ترجیح ۔ہر گھر کے حالات مختلف ہوتے ہیں ۔کوئی ایک قاعدہ قانون ہر گھر پر لاگونہیں کیا جاسکتا لیکن گھر کا ماحول پرسکون بنانے میں عورت کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے ۔یہ گھر عورت سے قربانیاں مانگتے ہیں اور ایک سمجھدار عورت اپنے گھر کوٹوٹنے سے بچانے کیلئے ہر قربانی دینے کو تیار ہوتی ہے ۔اس کے باوجود شیطان کی چالوں سے چوکنا رہنے کی بے حد ضرورت ہوتی ہے کیونکہ شیطان کے چیلوں کا سب سے بڑا کارنامہ میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالنے کیلئے فتنہ انگیزی کرنا ہے اس کی سب سے بڑی چال غلط فہمیاں پیدا کرنا جھگڑے ڈلوانا ہوتا ہے جس میں معصوم بھولی بھالی لڑکیاں ہی نہیں بعض اوقات اچھی خاصی سمجھدار عورتیں بھی اپنی ذات کی برتری ثابت کرنے اورمردوں کو نیچا دکھانے کی خواہش میں پھنس جاتی ہیں ۔رشتوں کا احترام نہ کرنا ضد میں آکر فرائض سے غفلت برتنا ان جھگڑوں کومزید بڑھا دیتا ہے ۔ایسے حالات میں آپ زندگی کی کسی بھی منزل پر کیوں نہ ہوں ناشکری غالب آجاتی ہےاور خودترسی طاری ہو جاتی ہے اور بالآخر عمر کے کسی بھی حصے میں گھر ٹوٹ جاتے ہیں۔

ہم سے پہلی نسل یعنی ہمارے بزرگوں میں صبر وتحمل زیادہ تھا۔ماں باپ کی تربیت لڑکیوں کیلئے بچپن سے ہی شروع ہو جاتی تھی اور سب سے بڑی بات کہ مشترکہ خاندانی نظام میں اگرچہ پیچیدگیاں بھی ہوتی تھیں لیکن گھر صحیح معنوں میں تربیت گاہیں ہوتے تھے۔جہاں باپ اپنے ماں باپ کی خدمت کرتا تو بچوں کے لئے مثال بنتا تھا۔ماں صبر اور برداشت سے ساس سسر کی خدمت کے ساتھ دادا دادی چچا پھوپھو کا مقام پہچاننا سکھاتی تھی۔مشترکہ امور کے فیصلے بزرگوں کی رائے سے کئے جاتے تھے۔بچے ایسے ماحول میں بہت کچھ خودبخود سیکھ جاتے تھے۔آج کی نئی نسل لڑکا ہو یا لڑکی، Independent گھروں میں صرف ماں باپ کے ساتھ پلتے بڑھتے ہیں۔انہیں کسی رشتہ کا احترام اورادب آداب کا شعور ہی نہیں ملتا اوپر سے بیچارے ٹی وی کے گمراہ کن مناظر نے بیبا کی اور زبان درازی کی ایسی ٹریننگ دینی شروع کی ہوئی ہے کہ ماں باپ بھی بے بس ہوکر رہ گئے ہیں۔اونچے Status کی ہوس میں دلوں میں وسعت نہیں رہی لہٰذا ذرا ذراسی بات پر گھر میدان جنگ بن جاتے ہیں، اللہ اوراس کے رسولؐ کے احکامات سے دوری تشویشناک حدتک خطرناک ہے۔اتنی بے شماررسموں پالروں کے چکروں ،خوب سے خوب تر دکھانے ،دوسروں کو نیچا دکھانے کیلئے بے

مفاہمت کے اصول سکھائیں، لڑ جھگڑ کر واپس میکے آنے کی سختی سے حوصلہ شکنی کریں اور گھروں کو ٹوٹنے سے بچائیں۔

دریغ روپیہ برباد کرنے کے بعد جو بندھن باندھے جاتے ہیں دوسرے دن ہی طعنوں، لڑائیوں اور جھگڑوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ مائیں اپنی بیٹی کو کسی سے نہ دبنے کی ٹریننگ دیتی رہتی ہیں۔ بالآخر اکثریت گھروں کی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔ حالانکہ ماؤں کو چاہیے کہ وہ بیٹیوں کو خاوندوں کو قابو میں رکھنے کی بجائے مفاہمت کے اصول سکھائیں، لڑ جھگڑ کر واپس میکے آنے کی سختی سے حوصلہ شکنی کریں اور گھروں کو ٹوٹنے سے بچائیں۔ بیٹیوں کی مائیں اپنے بیٹوں کو اس بات کی ٹریننگ دیں کہ وہ اپنی ذمہ داریاں دونوں رشتوں کو ان کا جائز مقام دے کر پوری کریں۔ ماں کا احترام بھی اُن کا فرض ہے جبکہ بیوی کو محبت ملنا اسکا جائز حق ہے جو سارے رشتے چھوڑ کر صرف اس کے لئے اس گھر میں آئی ہے۔ بیٹوں کی ماؤں کا بھی یہ کڑا امتحان ہے کہ وہ ایک دم سے روایتی ساس نہ بن جائیں نہ ہی بہت سی توقعات دل میں پال لیں جن کے پورا نہ ہونے سے انہیں دکھ ہی دکھ ملیں۔ بلکہ پیار اور محبت سے اس کے دل میں اپنا مقام پیدا کریں۔ بیٹوں کے ذہنوں میں ڈالیں کہ اگر تم بیوی کو ماں کی طرح کا بنانا چاہو گے یا دیکھنا چاہو گے تو خوامخواہ دکھی ہو جاؤ گے۔ جس زمانے میں تم پیدا ہوئے ہو اور جس زمانے میں وہ پیدا ہوئی ہے اسی زمانے میں جینا سیکھو۔ پیار محبت سے کچھ سکھا سکو سکھا دو، زبردستی کرو گے تو گھر ٹوٹ جائے گا۔ اگرچہ لڑکیوں کے دل میں اپنے گھر کے بہت قیمتی ہونے کا احساس بہت پختہ ہونا چاہیے۔ گھر چاہے چوبارہ ہو یا شاندار محل، ہر صورت میں اس کی حفاظت عورت کا فرض ہے اسے یہ پتہ ہونا چاہیے کہ اسکا دکھ سکھ، جینا مرنا سب اسکے شوہر کے ساتھ ہے۔ روٹھ کر میکے جانے کی کبھی کوشش نہ کریں، سسرالی ماحول کو اپنائیں۔ اپنے میکے کا ماحول دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش نہ کریں۔ شوہر کے ماں باپ سے مقابلے کی کوشش انہیں خود اپنی نظر میں گرا دے گی۔ ایک لڑکی جو جوان ہے، ماں باپ کا گھر چھوڑ آئی ہے وہ اپنے آپ کو نئے گھر کے مطابق بدل سکتی ہے، سسرال کا سارا گھر نہیں بدلا جا سکتا۔ جہاں مشترکہ رہائش نہ ہو وہاں بھی کچھ لو کچھ دو کا معاملہ محبت سے کریں۔ انشاء اللہ گھر مضبوط ہونگے ورنہ یہ مضبوط ترین رشتہ کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جانے والا ہے......کبھی بھی کسی بھی وقت......آپ کی پوری کوشش ہونی چاہیے کہ گھر ٹوٹنے نہ دیں اسی میں اطمینان ہے اسی میں عزت ہے، ایسے ماحول میں ایک اچھی نسل اچھی قدریں اور اچھی روایات کو آگے لیکر چلنے والی قابل تعریف نسل وجود میں آتی ہے۔

فرمانِ الٰہی ہے ”عورت اور مرد ایک دوسرے کا لباس ہیں۔“ اللہ تعالیٰ نے عورت کو مرد کے سکون کے لئے بنایا ہے نکاح کا بندھن مرد عورت کے رشتے کو پاکیزہ بناتا ہے تاکہ وہ جائز محبت سے لطف اندوز ہوں...... بلا خوف وخطر......ان کی اولاد جائز اور پاکیزہ اولاد کہلائے، وہ آپس کی پرائیویٹ باتوں کی تشہیر نہ کریں، چھوٹے چھوٹے گھریلو جھگڑے آپس میں ختم کریں، عزت کریں، عزت کروائیں اور آنے والی نسل کی شخصیت کو بھی ٹوٹ پھوٹ سے بچائیں۔ جب گھر ٹوٹتا ہے تو سبھی کچھ بکھر جاتا ہے۔ بچے خاص طور پر تباہ ہو جاتے

ہیں۔

ہرلڑکی کواپنا میکہ پیارا ہوتا ہے ۔شوہر کے ماں باپ اپنے ماں باپ جیسے پیارے کبھی نہیں ہو سکتے ۔شوہر کے بہن بھائی اپنے بہن بھائیوں کی طرح پیارے نہیں ہو سکتے لیکن اگر کوشش کی جائے تو ان سے اچھا برتاؤ کر کے بدلے میں اچھے برتاؤ کی توقع تو کر سکتے ہیں اور اگر یہ سوچ لیا جائے کہ یہ میرے اس پیارے شوہر کے ماں باپ بہن بھائی ہیں جس سے اب میری ساری زندگی وابستہ ہے، یہ طرزِ عمل گھر میں خوشیاں بکھیر سکتا ہے، میں ان کی عزت کروں گی تو میرے رشتہ داروں کو عزت ملے گی ، گھر مضبوط ہوگا ، میرے پاؤں اس گھر میں مضبوطی سے جمے رہیں گے، اگر کسی ایک سے کوئی وقتی اختلاف ہو بھی جائے تو بہت سے مجھے پیار کرنے والے میرا ساتھ دینے کو تیار ہونگے ۔چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کر دینا بھی ہمارے ہاتھ میں ہے یعنی عورت کے ہاتھ میں، اور رائی کا پہاڑ بنا دینا بھی ہمارے ہاتھ میں ہے ۔صبر اور شکر کے ساتھ شوہر کی رفاقت کو اللہ کا انعام جانیں اور گھر کو جنت بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑیں ۔کیونکہ یہ بھی میرے اللہ کا اور اس کے رسولؐ کا حکم ہے کہ جو عورت پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھے رمضان کے روزے رکھے اور اپنے شوہر کی اطاعت کرے وہ جنت کے جس دروازے سے چاہے جنت میں داخل ہو جائے۔

ہر عورت کے لئے لمحۂ فکریہ ہے کہ وہ خود بھی اپنے گھر کی حفاظت کرے اور اس نئی نسل کی تربیت بھی انہی خطوط پر کرے کہ انہیں جس گھر کا بھی نصیب بننا ہے اس کو اپنے حسنِ سلوک سے مضبوط بنانا ہے تاکہ شیطان کی چالیں اس کے پیارے گھر کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔مرد جو دونوں رشتوں کے درمیان پل کا کام دیتا ہے اس کو پرسکون گھر ملے لیکن یہ مثل بھی مشہور ہے کہ مرد بیلچوں سے بھی گھر نہیں توڑ سکتا مگر عورت سوئی کی نوک سے گھر توڑ کر رکھ دیتی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر فرح کوثر فاروق، شارجہ

گرمیوں کی چھٹیاں کیسے گزاریں

گرمیوں کی چھٹیاں ایک ایسا انمول اور قیمتی وقت ہے کہ اگر اسے صحیح منصوبہ بندی (planning) کے ساتھ گزارا جائے تو بے شمار فائدے سمیٹے جا سکتے ہیں۔ سکول یا کالج جانے کی ٹینشن اور ہوم ورک کی فکر سے نجات مل چکی ہوتی ہے، امتحانوں کا بوجھ بھی سر سے اتر چکا ہوتا ہے۔ لہٰذا بچے اور والدین ایک بہتر ذہنی کیفیت سے کافی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ سالہا سال کے تجربے (Trial and error) سے کچھ اہم نکتے ہماری سمجھ میں آئے ہیں لہٰذا بہنوں کے ساتھ اسے share کرنا چاہوں گی۔

ا۔ سب سے پہلی اور نہایت ضروری بات یہ ہے کہ منصوبہ بندی کی جائے اور یہ کام بچے اور والدین مل کر کریں تاکہ سب کی رائے اور مشورے شامل رہیں۔ اور ہر کوئی ذمہ داری محسوس کرے۔ یہ کام چھٹیاں شروع ہوتے ہی پہلے دوسرے دن کر لینا چاہیے۔ بہت زیادہ ٹال مٹول سے زیادہ بہتر نتائج مرتب نہیں ہوتے۔ کتنا وقت بچے گھر میں گزاریں گے اس کی علیحدہ منصوبہ بندی ہو اور کتنا وقت کسی دوسرے شہر یا ملک میں بسر ہوگا۔ اس کی علیحدہ سے planning کریں۔

۲۔ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے کہ

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

صبح کے وقت میں جو برکات اور خزانے مخفی ہیں وہ ہم سب کسی نہ کسی موڑ پر آزما چکے ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات اچھی طرح سے بچوں کو سمجھائی جائے کہ چھٹیوں میں صبح کا وقت سونے میں ضائع نہ کریں گے۔ جسم کی فطری ضرورت یعنی رات کو سونے کے عمل کو تبدیل کر کے جاگتے رہنا اور صبح دیر تک سونے سے بچوں کی صحت پر بھی مضر اثرات پڑتے ہیں اور قیمتی وقت تو ضائع ہو ہی جاتا ہے۔ نبیؐ نے بھی اپنی اُمت کے لئے صبح کے وقت میں برکت ڈالنے کی اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی جو کہ قبول ہوئی۔

مشہور کہاوت ہے کہ ''نومُ الصُّبحِ تَمنعُ الرِّزق'' یعنی صبح کا سونا روزی کو روکتا ہے۔

ہمارا ذاتی تجربہ ہے کہ صبح فجر کے بعد ایک تو تھوڑے وقت میں زیادہ کام کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا یہ کہ بہتر کام کیا جاتا ہے یعنی کوالٹی اور کوانٹٹی دونوں حساب سے کام کرنے کی صلاحیت بڑھی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ افسوس کہ آج کی نوجوان نسل رات گئے تک ٹیلی ویژن یا انٹرنیٹ میں مشغول رہتی ہے اور صبح کا یہ قیمتی وقت سونے میں گزار دیتی ہے۔ صحت پر بھی اس عادت کے مضر اثرات پڑتے ہیں۔ جسم کی فطری گھڑی کو الٹا کر دینے سے صحت اچھی ہونے کی بجائے اُلٹا خراب ہو جاتی ہے۔

ا۔ دیر تک خالی پیٹ سونے سے تیزابیت یعنی acidity کا معدہ میں بڑھ جانا اور gastritis کی شکل بن جانا ایک معمولی بات ہے جو بڑھتے بڑھتے peptic ulcer کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔

۲۔ دائمی سر درد کی شکایت رہنے لگتی ہے جس کی نوبت میگرین تک پہنچ جاتی ہے۔

۳۔ کمر درد کی شکایت رہنے لگتی ہے۔

۴۔ قبض یا constipation کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔

۵۔ ہڈیاں کمزور ہو جاتی ہیں parathyroid gland کے عمل (function) کے ڈسٹرب ہونے سے ہڈیوں سے calcium نکل کر آنتوں کے ذریعے جسم سے خارج ہونے لگتی ہے۔

۶۔نفسیاتی بیماریاں ، اعصابی کھچاؤ اور جکڑاؤ پیدا ہونے لگتا ہے۔بعض صورتوں میں رات کو دیر تک جاگتے اور صبح دیر تک سوتے رہنے والے نوجوان کو ڈپریشن کا مرض بھی لاحق ہو جاتا ہے۔

حضورؐ نے عشاء کے بعد جاگنے اور گفتگو کرنے کی ممانعت فرمائی اور فرمایا عشاء کے بعد وہی شخص جاگے جس نے کوئی عبادت کرنی ہو یا گھر والوں سے ضرورت کی بات کرنی ہو۔لہٰذا آئیں یہ ارادہ کرتے ہیں کہ ان گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم خود بھی اور اپنے بچوں کو سحر خیزی سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کریں گے۔جلد عشاء کی نماز کے بعد سو جائیں اور صبح فجر کے وقت اُٹھ کر نماز اور قرآن اور مسنون اذکار سے فارغ ہو کر چہل قدمی کے لئے جائیں ہلکی پھلکی ورزش کریں یا اپنی پسند کا کوئی کھیل کھیلیں اور اس کے بعد دن کے کاموں میں لگ جائیں۔اپنی بنائی ہوئی منصوبہ بندی پر عمل شروع کر دیں۔پھر نماز ظہر کے بعد بچوں کو دو تین گھنٹے سونے کا موقع دے دیا جائے یوں آپ دیکھیں گے کہ گویا زیادہ وقت آپ کے ہاتھ لگ گیا ہے۔صحیح معنوں میں وقت میں برکت پڑ جائے گی ۔آج کل جو ہمیں ہر کوئی شکایت کرتا ہوا ملتا ہے کہ وقت میں برکت نہیں رہی تو اس کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم صبح سو کر وقت کی برکت کو خود گنوا دیتے ہیں۔

۳۔ چھٹیوں میں بچوں کی توجہ نئی skills کو سیکھنے کی طرف مبذول کرائی جائے۔مثلاً لڑکیوں کو کھانے پکانے کی ترکیبات اور امور خانہ داری سکھانے کی طرف توجہ دیں اور bakingوغیرہ سکھائیں اسی طرح سے عربی زبان خود بھی سیکھیں اور بچوں کو بھی اپنے ساتھ سکھائیں کم از کم اس حد تک کہ قرآن وحدیث کو صحیح طرح سے سمجھ اور پڑھ سکیں۔اس میں علم تجوید اور عربی گرامر کے قواعد شامل ہیں ۔اس کے علاوہ کمپیوٹر کا ضروری علم آج کل کے عہد کے لئے ناگزیر ہے ۔موثر دعویٰ کا کام کرنے کے لئے power point کی presentations بنانا سیکھیں خود بھی اور اپنے بچوں کو بھی سکھائیں جن کے بچے کمپیوٹر کی skill میں ماہر ہیں، وہ مائیں ان چھٹیوں میں ان سیفائدہ اٹھائیں اور ان سے کمپیوٹر استعمال کرنا سیکھیں۔public speakingمیں بھی مہارت حاصل کریں۔کلامِ اقبال کو بھی موثر انداز میں ایک کورس کی شکل میں پڑھنا اور پڑھانا بے شمار فائدے دے سکتا ہے۔جو لوگ استطاعت رکھتے ہوں اور شوق بھی ہو وہ قرآن کو حفظ کرنے پر توجہ دیں۔

بتول میگزین

دعا

(انتخاب: ام عمارہ۔گوجرہ)

مرے دل کی ہر اک دھڑکن میں تیرا نام ہو یارب
نہ بھٹکوں سیدھے رستے سے، ترا انعام ہو یارب
کٹی غفلت میں نادم ہوں مگر اب یہ تمنا ہے
کہ تیرے نیک بندوں میں میرا بھی نام ہو یارب
رکھوں زخموں پہ مرہم اور گرتوں کو سہارا دوں
کہ سب میں بانٹنا خوشیاں، یہ کام میرا کام ہو یارب
نہ دولت ہو، نہ دنیا ہو، نہ شہرت ہو زمانے کی
وفا میں، بندگی میں، سادگی میں نام ہو یا رب
کرم کی ہو نظر تیری تو بیڑا پار ہو جائے
ترے نورِ ہدایت میں مرا انجام ہو یا رب

اپنے بتول کے لئے

(رشیدہ صدف۔گجرات)

میں نے جب سے شعور کی آنکھ کھولی گھر میں تعلیم وتعلم کا ماحول پایا، فجر کے بعد قرآن پاک سب بچے ابا جی سے پڑھتے پھر جب سورج طلوع ہو جاتا صبح چمک اٹھتی تو ابا جی بوستان و گلستانِ سعدی اور مختلف کتابیں پڑھتے ساتھ ہی ہمیں بھی اشعار گاہے بگاہے سناتے رہتے، اس طرح ہمیں مطالعہ کا شوق ہو گیا پورے محلے میں ہمارا گھرانہ وہ خوش قسمت گھرانہ تھا جہاں حرف شناسی اور حق شناسی کے لئے شعوری کوشش کی جاتی تھیں اور اس طرح حالات شناسی بھی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھ رہی تھی، ہمارے گھر میں روزانہ اخبار نوائے وقت آتا جس کو اجتماعی طور پر پڑھا جاتا اور ہمیں سرخیاں پڑھنے اور لکھنے کی تاکید ہوتی۔ ''بچوں کی دنیا'' رسالہ سب پڑھتے البتہ بڑی باجی کے ہاتھ میں بتول رسالہ دیکھتی پھر ''نور'' بھی آنے لگا، کچھ پڑھتی کچھ چھوڑ دیتی، سمجھ کم ہی آتی البتہ ''بتول اور نور'' سے رشتہ پکا ہو گیا۔ ایشیا اور ترجمان کو ہم بچے چھوتے بھی نہ تھے۔

ہمیں سلیبس کے علاوہ زیادہ رسالے پڑھنے کی اجازت بھی نہیں ہوتی تھی ہمیں باور کرایا جاتا تھا کہ رسالے پڑھنے سے بچے خراب ہو جاتے ہیں۔ بتول جب باجی پڑھ رہی ہوتیں اور ابا جی کچھ نہ کہتے تو لگتا یہ کوئی اچھی چیز ہے ورنہ تو ہمارے بستے بھی دیکھے جاتے، ادب واحترام کا دور تھا ایک بار پتہ چل جاتا یہ بات ابا جی کو یا چاچا جی کو پسند نہیں ہے ہم کبھی نہ کرتے تھے۔

بھائی تحریک میں تھے اور پڑھنے لکھنے کے شوقین بھی، اکثر سیاسی تبصرے ہوتے، ملکی حالات کا جائزہ لیا جاتا اس طرح ہمارا شعور اپنی کلاس فیلوز کی نسبت زیادہ پختہ تھا۔

اصل میں بتانا یہ چاہ رہی تھی کہ میری ''بتول اور نور''

سے دوستی بہت پرانی ہے۔نور تو بچپن رخصت ہونے کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا مگر بتول جاری تھا اور جاری رہا مگر نہ جانے کیوں ایک سال سے خود بخود بند ہو گیا کمی محسوس کرتی رہی دوایک مرتبہ خط بھی لکھا مگر نجانے کیوں مجھ سے میرا ''بتول'' راضی نہ ہوا۔

واقعی جب کوئی چیز،کوئی نعمت چھن جاتی ہے تو قدر آتی ہے دوسروں سے لیکر پڑھ لیتی ہوں طاہرہ باجی سے خرید کر پڑھ لیتی ہوں مگر سچی بات ہے رسالے کو کھولنے اور پھر فوری پڑھنے کا ذائقہ ہی الگ ہوتا ہے آج کل کرتے آدھا مہینہ گزر جاتا ہے تو پھر بتول ملتا ہے۔مانگے کی چیز پھر مانگے کی ہوتی ہے،اس طرح اب فہم قرآن سنٹر میں ''بتول'' آتا ہے تو ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے پہلے میں پڑھوں، بتول سے اب اُداس ہی رہتی ہوں بچپن کے ساتھی ''بتول'' کو اب پھر جاری کروانا چاہتی ہوں اب تو مجھے بتول پر لکھے شعر کی بھی سمجھ آ گئی ہے جو کبھی سمجھ نہیں آیا کرتا تھا۔

کیا آپ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہے؟

(آسیہ بی بی)

کیا ہے۔جو مجھے بے چین کئے دیتا ہے۔ہاں شاید ...... ایسی آگ ہے جو کوئلوں سے دھیرے دھیرے سلگ رہی ہے اور پگھلتا ہوا خون جگر کوئلوں کو بجھائے جاتا ہے۔ کیسی ہے یہ آگ؟ اور یوں کیوں جلائے جاتی ہے۔شاید دیوانگی ہے یا انتہائے عشق...... جو بھی ہو اک بات تو یقینی ہے۔اس آگ کو موت صرف موت ہی سرد کر سکتی ہے۔کہا جاتا ہے کہ یہ مرض لا علاج ہے۔

روز و شب ہیں کہ آتے جاتے۔پلک جھپکتے میں گزر جاتے ہیں اور میں کیسے حیران و سرگرداں کھڑی سوچتی رہ جاتی ہوں یہ لوگ بدلتے کیوں نہیں؟ سمجھ کر کیوں نہیں دیتے ؟ میری بات مانتے کیوں نہیں ؟ حقیقت سمجھ کیوں نہیں جاتے ؟ کیوں صحرا میں سرگراں سرابوں کے پیچھے ہیں؟ فانی دنیا کی حقیقت کو سمجھ کیوں نہیں جاتے ؟ کیوں نہیں لپکتے حجاب کے پیچھے چھپی حقیقت پر؟ ...... کیوں؟......آخر کیوں؟...... کیا انہیں کھلی،بکھری نشانیاں نظر نہیں آتیں؟......آتی کیوں نہ ہونگی کہ یہ سب روز روشن کی طرح عیاں ہے۔مگر شاید یہ ہمت نہیں پاتے۔روشنی کی چمک میں آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں ایسوں کو کون سمجھا سکتا ہے۔جو خود ہی دیکھنا نہ چاہیں۔ ایسی حقیقت کو جسے اندھیرے بھی تسلیم کئے دے رہے ہیں۔

شاید یہ مُردوں کی طرح ہیں۔صرف سنے جاتے ہیں اور بس......

انہی خیالوں میں ہر نئی صبح ایک نئی روشنی دیتی ہے ایک نیا عزم ہمراہی ہوتا ہے۔میں پھر کمر کسے مصروف ہو جاتی ہوں۔کچھ نئے ولولے ڈھارس بندھاتے ہیں۔کچھ کھلتی کلیاں نیا پیغام دیتی ہیں۔نئی امیدیں آگے بڑھاتی ہیں نئے ولولوں کے ساتھ......اور پھر ہر شام اس حال میں آتی ہے کہ تھک کر چور چور ہو چکی ہوتی ہوں۔اک دل ہوتا ہے جو پمپ کرتا ہے طمانیت............اور سب کچھ ہی اور پھر دریائے سکینت ہر سو بہنے لگتا ہے اک یاد ہر دھڑکن سے اٹھتی ہے......صرف اک یاد......محبوب کی یہ بات جس کا مفہوم ہے۔

''میری مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی اور جب آس پاس کا ماحول آگ کی روشنی سے چمک اٹھا تو کیڑے پتنگے اس پر گرنے لگے اور وہ شخص پوری قوت سے ان کیڑوں پتنگوں کو آگ سے روک رہا ہے لیکن پتنگے ہیں کہ اس کی کوششوں کو ناکام بنائے دے رہے ہیں اور آگ میں گرے پڑے ہیں اسی طرح میں تمہیں کمر سے پکڑ پکڑ کر آگ سے روک رہا ہوں اور تم ہو کہ آگ میں گرے پڑ رہے ہو۔

ہمارا ہے کیا؟

(تانیہ گلزار۔کراچی)

پاکستان کے پرائیویٹ چینلز پر ہر وہ چیز جو ہماری تہذیب سے الگ ہو پروان چڑھتی نظر آتی ہے۔آخر کیوں ہمارے ارباب اختیار کو ان چینلز کی یہ روش نظر نہیں آتی؟

14 اگست کو ہی دیکھ لیں تو تمام پرائیویٹ چینلز کے Icon ہرے ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح محرم میں کالے ہو جاتے ہیں۔ بسنت میں پتنگیں بنی نظر آتی ہیں۔ ویلنٹائن میں لال دل نظر آتے ہیں۔لیکن یوم کشمیر پر ایک ''پتہ'' بھی لٹکتا نظر نہیں آتا۔ پتے کی بات تو الگ ہے ان چینلز پر یوم کشمیر کے حوالے سے کوئی ڈرامہ نہیں دکھایا جاتا۔ تمام پرائیویٹ چینلز والے مغربی تہذیب کو تو اس قدر ترویج دیتے ہیں کہ ہمیں نعوذ باللہ یہ گمان ہوتا ہے کہ جیسے یہی تو ہماری تہذیب ہے۔ان چینلز کو اب ہم ''ہمارے'' چینلز بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان پر کچھ بھی ہمارا نہیں، سب غیروں کا دکھائی دیتا ہے چہرے ہمارے، باتیں غیروں کی، انداز غیروں کے، زبان غیروں کی، نقالی ان کی، رسم و رواج ان کے مفادات کا تحفظ ان کا......آخر ان پر ہمارا ہے کیا؟

جہیز کی زنجیر

(سیدہ نزہت رضا)

کنول کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی سسرال والوں کی فرمائش پر شہر کے بڑے ہوٹل میں شادی کی رسومات ادا کی گئیں شادی کے ٹھیک تین ماہ بعد ہی جہیز میں بنگلہ اور گاڑی نہ لانے کی وجہ سے کنول پر سسرال والوں کا ظلم وتشدد شروع ہوگیا۔ وہ ساس جو شادی سے پہلے صدقے واری جاتی تھی اسے اپنی بہو میں ہزار خامیاں نظر آنے لگیں دن رات گھر کے کام کاج کرنے والی کنول کو سسرال سے ملنے والے طعنوں کی برسات اور شوہر کی مار پیٹ نے ادھ موا کر دیا اور ایک دن بیٹی پر ہونے والے ظلم سے بے خبر والدین کو کنول جیسی پیاری بیٹی کی جلی ہوئی لاش سے نواز دیا گیا۔

ایسا ہی کچھ شبنم کے ساتھ بھی ہوا فرق صرف اتنا تھا کہ وہ ذلت و رسوائی کی موت مار دی گئی شبنم اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی والدین نے اسے بڑے ارمانوں سے رخصت کیا لیکن شادی کے اگلے دن ہی لالچی سسرالیوں نے ایک فرنشڈ گھر کی مانگ کرڈالی جس کے پورا نہ ہونے پر شبنم کو نہ صرف طلاق کے کاغذات تھما کر والدین کے گھر واپس بھیج دیا گیا بلکہ شبنم کا سارا جہیز بھی ہڑپ کرلیا گیا۔

ایسے بہت سے واقعات ہمیں روزانہ اخبارات میں پڑھنے اور اردگرد سے سننے کو ملتے ہیں اور ہم خاموش تماشائی

کی طرح معاشرے کی اس ظالمانہ ستم ظریفی کا نظارہ کر کے صرف افسوس اور ہمدردی کا اظہار کرنے پر اکتفا کرتے ہیں حیرت کی بات تو یہ ہے کہ کوئی بھی فرد اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی زحمت گوارا نہیں کرتا اور لڑکی کے گھر والوں میں اتنی جرأت اور ہمت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اپنی بے بسی پر احتجاج کر سکیں کیونکہ جہیز کی صورت میں صنف نازک کا سودا کرنے والے ان بے حس سسرالیوں میں غیرت نام کی کوئی شے باقی ہی نہیں رہتی سوال یہ اٹھتا ہے کہ جہیز کے نام پر عورت کا یہ استحصال کب تک جاری رہے گا؟

اسلام پر مبنی رسم و رواج اور روایات کی موجودگی کے باوجود اس نام نہاد اسلامی معاشرے میں بے شمار غیر اسلامی رسومات رواج پا چکی ہیں جو کسی لحاظ سے بھی اسلامی معاشرے کے شایانِ شان نہیں انہی رسومات میں سے ایک رسم بیٹی کو جہیز دینے کی ہے حالانکہ لڑکی کی قابلیت اور سیرت ،عقل و شعور، اخلاق اور ایمان و حیاء جیسی خوبیوں سے ہی کوئی شادی کامیاب ہوتی ہے۔ بیشتر والدین یہ سمجھتے ہیں کہ قیمتی سے قیمتی چیز جہیز میں دینے سے ان کی بیٹی سسرال میں خوش رہے گی وہ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ان کی بیٹی کے لئے بہترین تحفہ اس کی اعلیٰ تعلیم اور تربیت ہوتی ہے اور ویسے بھی خوشیاں روپے پیسے سے نہیں خریدی جا سکتیں اور اگر ایسا ممکن ہوتا تو ہر بیاہی جانیوالی لڑکی کا سسرال خوشیوں کا گہوارہ بن جاتا۔ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں ہر سال بہت سی لڑکیاں جہیز نہ ہونے کی وجہ سے تمام عمر والدین کی دہلیز پر گزارنے پر مجبور ہوتی ہیں یا کم جہیز لانے پر انہیں طلاق سے نواز دیا جاتا ہے۔

ملک میں ہونے والی طبقاتی تقسیم نے اس رسم کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے امیر طبقہ اپنی دھاک بٹھانے کی کوشش میں جہیز کے نام پر بے تحاشہ پیسہ لٹاتا ہے اور جہیز جیسی لعنت کا سہارا لیتا ہے جس کی وجہ سے یہ رسم پروان چڑھ رہی ہے۔ مڈل کلاس کے لوگ دکھاوے اور دوسروں کی نظر میں اونچا مقام حاصل کرنے کیلئے جہیز دیتے ہیں اور غریب طبقہ احساس کمتری سے بچنے کی خاطر اپنی بیٹیوں کو جہیز دینے پر مجبور ہے بظاہر تو یہ سب طبقات جہیز کو ایک لعنت تصور کرتے ہیں لیکن اپنی بیٹیوں کی شادی کے موقع پر جہیز کے نام پر چھوٹی سے چھوٹی چیز دینے کی بھی کوشش کرتے ہیں اور اگر بیٹے کی شادی ہو تو کوشش کی جاتی ہے کہ امیر گھرانے کی بہو لائی جائے تاکہ اس کے ساتھ آنے والی چیزوں سے گھر بھر جائے۔اور ہماری شان و شوکت میں اضافہ ہو سکے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں لڑکی کی بجائے جہیز کی اہمیت زیادہ ہے حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ جہیز جیسی لعنت بے شمار مسائل اور الجھنوں کا باعث بنتی ہے۔

حقیقت میں جہیز نہ صرف ایک افسوسناک عمل ہے بلکہ خودنمائی غرور و تکبر جیسی برائیوں کا سرچشمہ بھی ہے یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ شادی کی رسومات میں سب سے مہنگی اور لامحدود وسائل سے دوچار کرنے والی اس رسم سے عورت کی حیثیت اور عزت پامال ہو رہی ہے اب شادی کے اس مقدس رشتے کی اقدار برقرار رکھتے ہوئے معاشرے کی رگوں میں

ناسور کی طرح پھیلتی اس روش کو ختم کرنے کیلئے آگے بڑھنا نوجوان نسل کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔

ہم کیسی دنیا میں سانس لے رہے ہیں؟

(اُخت عطااللہ بلوچ۔کراچی)

آج میں آپ کو وہ ناقابل فراموش واقعہ سنانے جا رہی ہوں جسے میں کبھی بھول نہیں سکتی۔ ایک روز نماز مغرب کے بعد میں نے اپنی بھابی کو پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہلتے پایا میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ ہمارے محلے میں کسی لڑکے کو گولی ماردی گئی ہے یہ سن کر میں یکدم حیران و پریشان ہوگئی کیونکہ ہمارے محلے میں ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ میں سمجھی شاید کسی کو جان سے ہی ماردیا گیا ہے اور معلوم نہیں وہ ہمارے محلے کا ہی کوئی لڑکا ہے یا پھر کوئی اور؟ میں تشویش سے سوچنے لگی بیٹھنے سے آرام نہ ملا تو ٹہلنے لگی اتنے میں میرا بھائی آ گیا۔ کس کو گولی ماری گئی ہے ؟ میں نے بیقرار ہو کر پوچھا۔ میرے بھائی نے کہا کوئی دوسرے محلے کا لڑکا ہے بیچارا غریب سا ہے ہمارے علاقے کے بدمعاش نما دولڑکے اس کی ٹانگ پر گولی مار کر چلتے بنے اور اس کی ٹانگ سے خون بری طرح رس رہا ہے ۔یہ کہتے ہوئے میرے بھائی کی آنکھوں میں آنسو آگئے ۔افسوس ناک بات یہ تھی کہ وہاں تمام محلے والے جمع تھے انہوں نے دائرہ بنا کر اسے گھیر لیا تھا مگر کوئی اسے ایک گھونٹ پانی دینے کیلئے تیار نہ تھا اور وہ پانی پانی کی صدا لگا رہا تھا اور لوگ اپنے کانوں کو ڈھانپ کر کھڑے تھے اگر کوئی اس کی مدد کی حامی بھرتا نظر آتا تو کئی نظریں اسے تنبیہ کرتیں دیکھو تم اپنے فعل کے خود ذمہ دار ہو گے پولیس کو کیا جواب دو گے (کسی نے یہ نہ سوچا کہ اللہ کو کیا جواب دینگے) وہ لڑکا تقریباً 5 گھنٹے کسمپرسی کی حالت میں پڑا رہا۔ بار بار دردناک آواز میں کہتا بھائیو! میں مرنے والا ہوں میری مدد کرو مگر کوئی آگے نہ بڑھا صرف اس لئے کہ اس کی مدد کے بعد پولیس پوچھ گچھ کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کریگی اور آخر کار پولیس کو ایک بھاری رقم دیکر جان چھڑوانی پڑے گی بس کسی آدمی نے اتنا احسان کیا ایدھی والوں اور پولیس کو بار بار فون کرتا رہا، وہ تو جیسے سو رہے تھے ابھی آرہے ہیں ابھی آرہے ہیں۔ زخمی کی حالت غیر ہوتی جارہی تھی میرا دل بہت چاہ رہا تھا جاؤں اور جا کر اس کی مدد کروں کاش میں اس کو پانی اور گرم دودھ پلا سکتی لیکن میں بھی مجبور تھی ایک عورت کیا کرسکتی ہے پولیس کی بد تمیزیوں کو بھلا میں کیسے سہہ سکتی تھی۔ ایک طویل انتظار کے بعد پولیس کی گاڑی آئی اور اسے لیکر چلی گئی میں سوچتی ہوں یہ کیسا اسلامی ملک ہے جہاں ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو بے بسی سے مرتے ہوئے دیکھنے پر مجبور ہے لیکن اسے ہاتھ لگانا ناگہانی آفت کو دعوت دینا ہے۔ ہم کیسی دنیا میں سانس لے رہے ہیں؟؟؟

اتباع سنت

(فرحت نورین اکڑیانوالہ)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اے نبیؐ لوگوں سے کہہ دیجئے! کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو خود اللہ تعالیٰ تم سے محبت

کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرما دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ ان سے کہو اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت قبول کرو۔ (سورۃ ال عمران آیت نمبر ۳۱)

جس کو اللہ کی محبت کا دعویٰ ہو اس کو محمد ؐ کی اتباع لازم کرنی ہوگی اور یہ حب الٰہی کا ایک پیمانہ ہے۔ جو اپنے آپ کو سمجھتا ہے کہ وہ اس پیمانے پر پورا اترے گا تو اس کا دعویٰ درست ورنہ اس پیمانے میں سب کھوٹا کھرا ظاہر ہو جاتا ہے۔

جو آدمی اللہ سے محبت کرتا ہے اس کی علامت یہ ہے کہ وہ قرآن سے محبت کرتا ہے۔ جو قرآن سے محبت کرتا ہے وہ نبی کریم ؐ سے محبت کرے۔ اور جو محمد ؐ سے محبت کرے وہ سنت نبوی سے پیار کرے۔

یہ ہے اصل پیمانہ کیا ہم اس پر پورے اتر تے ہیں ......؟

اگر ہم ہر لمحہ سنت نبوی کی پیروی کرتے ہیں تو سمجھیں کہ ہمارا معیار درست ہے۔ اگر ہم اس پیمانے پر پورا نہیں اترتے تو ہم کو دیکھنا ہوگا کہ ہماری محبتیں کس کے لئے ہیں......؟ اور ہماری محبتوں کا معیار کیا ہے......؟

اکثر بھول جاتی ہوں

(امیر بی بی۔حیدرآباد)

کئی لمحات میں اوقات اکثر بھول جاتی ہوں
کہ ہوں کم ذات پر یہ بات اکثر بھول جاتی ہوں
میری خوشیاں میرا دکھ سکھ بندھا ہے میرے شوہر سے
چلے گی بس اُسی کی بات اکثر بھول جاتی ہوں
میں جس لمحے کبھی کمزوریوں کی زد میں ہوتی ہوں
نہ ہو آنکھوں سے تب برسات اکثر بھول جاتی ہوں
رہوں گی آہنی بن کر تو پھر خوشیاں ہی خوشیاں ہیں
خطا مجھ کو نہیں ہے راس اکثر بھول جاتی ہوں
کمالِ ضبط میں پوشیدہ ہے میری انا ساری
بکھرتے ہیں مگر جذبات اکثر بھول جاتی ہوں
مری خواہش مری سوچیں مری آزادیاں ساری
میرے شوہر کی ہیں خیرات اکثر بھول جاتی ہوں
بہت لوگوں سے اچھے حال میں رکھا ہے مولا نے
نہیں یہ یاد رہتی بات اکثر بھول جاتی ہوں

تعلیم کا مقصد

(ڈاکٹر فرح ارشد)

پیغمبر اسلام ؐ نے فرمایا کہ کوئی باپ اپنی اولاد کو اس سے اچھا تحفہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو تعلیم دے۔ دوسرا کوئی بھی تحفہ ہمیشہ وقت ہوتا ہے مگر علم کا تحفہ ایک ایسی چیز ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

ہر گھر کے بنیادی ستون ماں اور باپ ہوتے ہیں۔ دونوں کا باشعور ہونا سب سے زیادہ اہم ہے۔ علم کا اصل مقصد شعور کو بیدار کرنا ہے تاکہ انسان کبھی محدود سوچ میں مبتلا نہ ہو۔ اس کا ذکر کبھی جمود کا شکار نہ ہونے پائے پیغمبر اسلام ؐ نے فرمایا کہ پیدائش سے لحد تک علم حاصل کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم کسی وقتی نفع یا کسی وقتی نوکری کے لئے نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک مستقل عمل ہے جو انسان کی پیدائش سے لے کر اس کی موت تک جاری رہتا ہے علم کا اصل مقصد انسانی

شخصیت کی تعمیر ہے ۔ یہ کوئی وقتی کام نہیں ہے ۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے ۔علم کو دین و دنیا کے حسین امتزاج کی شکل میں ہونا چاہیے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ماں باپ ان دونوں میدانوں کا صحیح علم رکھتے ہوں ۔آج کل کے دور میں ہم نے علم کی اصل معرفت کو کھو دیا ہے اور اس کو وقتی دنیاوی مفادات کے حصول کا ذریعہ سمجھ لیا ہے کہ ڈاکٹر یا انجینئر بننا اس لئے ضروری ہے کہ اچھا رشتہ مل جائے گا یا اچھی نوکری مل جائے گی ۔اصل مقصد اس میں کہیں کھو گیا ہے حقیقتاً ہمیں باشعور لوگ چاہئیں جو اپنی اولین ذمہ داریوں کو سمجھیں اور ان کو احسن طریقے سے اور صحیح وقت پر ادا کرسکیں تاکہ ایک سلجھا ہوا معاشرہ فروغ پا سکے اور یہی اللہ کو اور اللہ کے رسول ﷺ کو ہم سے مطلوب ہے۔

(مولانا وحیدالدین خاں کی کتاب مطالعہ حدیث سے استفادہ کیا گیا)

بچوں کی تربیت میں والدین کا کردار

(صوفیہ شفیع ۔جڑانوالہ)

بچوں کو صحیح تربیت دینا ماں اور باپ دونوں کا فرض ہے ۔بچوں کو اپنے ساتھ مانوس رکھیں ،انہیں مناسب وقت دیں اور گاہے بگاہے دین کی تعلیمات سمجھاتے رہیں ۔ ماں باپ بچوں کے بہترین دوست بن سکتے ہیں خاندان بھر کے افراد آپس میں دوستانہ رویہ رکھیں تاکہ ان کے بیچ پیدا ہونے والی دیوار ختم ہو سکے اولاد اپنے ماں باپ کے رویوں سے اپنے کردار کی تشکیل کرتی ہے ۔ جہاں ماں باپ میں ہر وقت جھگڑے ہوتے ہوں، گھر کے بزرگ اپنی بہو بیٹیوں کے بیچ بیٹھ کر غیر مناسب ڈرامے اور موویز دیکھتے ہوں ، جہاں ماں باپ خاندان کے دیگر افراد کی چغلیاں کھاتے ہوں ،ایک دوسرے سے حسد نفرت اور عناد رکھتے ہوں ان کے درمیان پلنے والے بچے بھی وہی کردار اپنا لیتے ہیں ۔

لہٰذا سب سے پہلے ماں باپ دونوں کا تعلیم یافتہ اور با کردار ہونا بے حد ضروری ہے دوسرے ان میں فرائض کو بروقت ادا کرنے کا شعور ہو تبھی وہ اپنے بچوں کو باشعور بنا سکیں گے ۔

دیدۂ دل

(ربیعہ ندرت)

گاڑی سڑک پر چلتے چلتے سرخ بتی کی وجہ سے رک گئی ۔اچانک میرے کانوں میں آواز آئی ،اخبار لے لو، اخبار لے لو ۔ میں نے نگاہ اٹھائی تو میرے سامنے ایک نحیف و نزار بوڑھا اخباروں کا بنڈل اٹھائے کھڑا تھا۔اسکا پرانا اور ملگجا لباس اسکا حالِ زار بیان کررہا تھا ۔ اسکا کمزور اور جھریوں بھرا چہرہ گویا اس کی زندگی کی کھلی کتاب تھا۔اس کا لاغر جسم اس کی مفلسی کا پردہ چاک کررہا تھا۔اسے دیکھ کر میں نے دس روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ جواباً اس نے مجھے اخبار دینا چاہا۔ میں نے اخبار لینے سے انکار کیا تو وہ بولا ، یوں ہرگز پیسے نہ لوں گا ۔ چنانچہ میں نے ایک اخبار لے لیا تو اس نے فوراً دوسرا میری طرف بڑھا دیا میں نے کہا ۔بس بابا جی ،حساب برابر ہوگیا۔ وہ فوراً کہنے لگا کیسے برابر ہوگیا حساب ۔ دس روپے میں دو اخبار آتے ہیں ۔ پکڑو دوسرا ۔اس کے کڑے تیور دیکھ کر میں نے تعمیل کی اور

دوسرا اخبار بھی تھام لیا لیکن اس کے بعد میرے ذہن میں کئی سوالات اٹھنے لگے......خدایا، یہ کوئی خلائی مخلوق تو نہیں جو کسی اڑن طشتری سے زمین پر اتر آئی ہو؟ اتنے بوڑھے اور کمزور وجود سے انکار کی ایسی پاٹ دار آواز کیسے نکلی؟ کیا یہ ضمیر کی آواز تھی؟ کیا یہ خوداری کا لہجہ تھا؟ کیا یہ مفلسی کی کاٹ تھی؟ اور میں اس آواز کے آگے مسحور ہو کر کیوں رہ گئی ؟ میں نے اصرار کیوں نہ کیا؟ کیا انسان حق کے سامنے یوں بھی دب کر رہ جاتا ہے؟

وقت اور عمر نے اس بوڑھے کے باطن اور اس کی روح پر شاید کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔اسی لئے تو اس کی آواز جو اس کے مضبوط دل سے اٹھی تھی ،کیسی صاف اور واضح تھی ۔ اندرونی طور پر وہ آج بھی اتنا ہی جوان اور توانا تھا جتنا شاید آج سے تیس سال پہلے ۔ میں نے سوچا یہ کیسا عجیب آدمی ہے کہ ایک ہی وقت میں دو زندگیاں بسر کر رہا ہے ۔ اسکا ظاہر کمزور اور عمر رسیدہ ہے اور اسکا باطن مضبوط، پر اعتماد اور جوان ہے ۔ ذہن میں یہ سوچ آتے ہی دل سے صدا نکلی ۔ اسے آدمی نہ کہو۔ یہ تو وہی انسان ہے جو فرشتوں کا مسجود ہے ۔ میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں اپنی غلطی تسلیم کرتی ہوں اگر چہ قصور میرا بھی نہیں کہ میری آنکھ اتنی توانا تو نہیں کہ آدمی اور انسان کی شناخت کر سکے کیونکہ دونوں کے چہرے ایک ہی جیسے ہیں ۔مگر ہاں اے دل، جب تیری آنکھ بیدار ہو جاتی ہے تو حق شناسی کا حق ادا کر دیتی ہے ۔

دہی، ایک مکمل، عمدہ اور سستی غذا

خالص سفید رنگ کا حامل دہی، جس کے اوپر ہلکے کریم کلر کی ایک موٹی سی تہہ جمی ہوئی ہو، اپنی قدرتی حالت میں نہایت غذائیت بخش اور لذیذ شے ہے۔ ہلکے ترش ذائقے والے اس نیم منجمد دودھ کو ایک بہت عمدہ غذا قرار دیا جاتا ہے۔

دہی گائے، بھینس اور بھیڑ کے دودھ سے بنایا جاتا ہے۔ دہی وہ دودھ ہے جسے لیکٹک ایسڈ (Lactic acid) یعنی دودھ کے تیزاب کی مدد سے جمالیا جاتا ہے اور وہ گاڑھا ہوکر نیم منجمد سی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

دہی جمانے کا طریقہ

نیم گرم دودھ میں لیکٹک ایسڈ یا کوا ٹر چیچ دہی شامل کر دیا جاتا ہے اور اسے تقریباً پانچ گھنٹے کے لئے ہلائے جلائے بغیر چھوڑ دیا جاتا ہے تو وہ جم کر دہی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

دہی کی تاریخ

قدیم انسان کی غذا کا اصل ذریعہ اس کی بکریوں، بھیڑوں، اونٹنیوں، بھینسوں، گدھیوں اور یاکوں کا دودھ تھا۔ قدیم دور کے انسان نے معلوم کر لیا کہ جمایا ہوا یا خمیر کیا ہوا دودھ، تازہ دودھ کے مقابلے میں کہیں زیادہ قابل قدر ہے کیونکہ یہ کافی زیادہ دنوں تک باقی رہتا ہے اور اس میں ایک خاص قسم کا فلیور موجود ہوتا ہے۔

دہی کی غذائیت بخش حیثیت

یہ بہت آسانی کے ساتھ ہضم ہو جاتا ہے اور آنتوں کے نظام کو صحت مند اور ٹھیک ٹھاک رکھتا ہے۔ اس میں چربی اور کیلوریز بھی کم ہوتی ہے۔ ایک پیالہ دہی میں صرف ایک سو بیس سے ایک سو پچیس کیلوریز ہوتی ہیں اس لئے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ دہی کو مکمل غذا کہا جاتا ہے۔

بیکٹریا

دہی میں ایک قسم کے بیکٹریا ہوتے ہیں جو اچھی قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ بیکٹریا بڑی مقدار میں وٹامن بی پیدا کرتے ہیں جو کہ آنتوں کے نظام کو عمدہ اور درست حالت میں رکھنے کیلئے بہترین ہیں۔

کیلشیم

جزوی طور پر بالائی نکالے ہوئے دودھ سے بنے دہی کے ایک پیالے میں، جو کہ کیلشیم کے حصوں کا بہترین ذریعہ ہوتا ہے۔ دو سو چورانوے (۲۹۴) ملی گرام کیلشیم موجود ہوتے ہیں۔ جبکہ بغیر بالائی نکالے ہوئے دودھ سے بنائے گئے ایک پیالہ دہی میں دو سو بہتر (۲۷۲) ملی گرام کیلشیم ہوتا ہے۔

کیلوریز

دہی، ڈائٹنگ کرنے والوں اور وزن گھٹانے والوں

کے لئے ایک آئیڈیل غذا ہے۔اس میں کیلوریز کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔جزوی طور پر بالائی نکالے ہوئے دودھ سے بنائے ہوئے دہی کے ایک پیالے میں ایک سو پچیس (۱۲۵) کیلوریز ہوتی ہیں۔جبکہ بغیر بالائی نکالے ہوئے دودھ سے بنائے ہوئے دہی کے ایک پیالے میں کیلوریز کی تعداد ایک سو پچاس (۱۵۰) ہوتی ہے۔

کاربوہائیڈریٹ

فوری طور پر بالائی نکالے ہوئے دودھ سے بنائے جانے والے ایک پیالی دہی میں کاربوہائیڈریٹس کی مقدار تیرہ گرام ہوتی ہے جبکہ بغیر بالائی نکالے ہوئے دودھ سے بنائے جانے والے ایک پیالہ دہی میں یہ مقدار بارہ گرام ہوتی ہے۔

چربی کی مقدار

دہی میں چربی کی مقدار کم ہوتی ہے اور نتیجتاً اسے اکثر و بیشتر ڈائٹ کے لئے ایک بہت اچھی غذا قرار دیا جاتا ہے۔جزوی طور پر بالائی نکالے ہوئے دودھ سے بنائے گئے ایک پیالی دہی میں چار گرام چربی موجود ہوتی ہے۔جبکہ بغیر بالائی نکالے ہوئے دودھ سے تیار کردہ دہی کی اس مقدار میں چربی کی مقدار آٹھ گرام ہوتی ہے۔

لیکٹوس (Lactose)

لیکٹوس کو دودھ کی شکر بھی کہا جاتا ہے۔یہ دہی کو بنانے میں اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں بیکٹر یا پرورش پاتا ہے اور یہ دہی کی کچھ مقدار کو لیکٹک ایسڈ میں بھی تبدیل کر دیتا ہے۔لیکٹوس توانائی بخش ہے اور آنتوں کی صفائی میں مدد دیتا ہے۔دہی میں وٹامنز،منرلز اور پروٹین کی ایک بڑی مقدار ہوتی ہے۔اس میں Ascorbic acid اور وٹامن سی کی اچھی مقدار پائی جاتی ہے۔

زود ہضم

دہی سادہ دودھ کے مقابلے میں زیادہ آسانی کے ساتھ ہضم ہو جاتا ہے۔یہ آنتوں میں ضروری بیکٹر یا کو برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔بہت سے ڈاکٹر اینٹی بائیوٹک دوائیں لینے والے مریضوں کو دہی بھی استعمال کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔کیونکہ اینٹی بائیوٹک دوائیں نظامِ ہضم کو متاثر کرتی ہیں۔

دہی کو اگر ادرک کے ساتھ ملا کر استعمال کیا جائے تو یہ پیٹ کے درد کو دور کرتا ہے۔دہی کو دانوں کے علاج کے لئے ،فوڈ پوائزننگ ، دھوپ کی وجہ سے پیدا ہونے والے داغ دھبوں کو دور کرنے کیلئے اور دیگر مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

غذاؤں کی طبی خصوصیات کے ایک ماہر ڈاکٹر امان کا کہنا ہے کہ ہیپاٹائٹس بی میں دہی کے بہت زیادہ استعمال سے اس کی شدت میں کمی آتی ہے۔

جلد جواں تو آپ حسین

جو لوگ اپنی جلد کی اہمیت کو سمجھتے ہیں وہ اس کی رونق کا بھی بھرپور خیال رکھتے ہیں۔ گرم موسم میں سورج کی تپش آپ کی جلد کو بری طرح متاثر کر سکتی ہے اس موسم میں جلد کی حفاظت کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ ریسرچرز کا کہنا ہے کہ عمر کے معاملے میں سکن ٹون انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے یہ یا تو آپ کو بیس سال عمر میں کم دکھا سکتی ہے یا پھر اپنی عمر سے بیس سال زیادہ کی دکھا سکتی ہے۔

محققین کا کہنا ہے کہ اپنی جلد کو سورج سے بچائیں۔ یہ سکن ٹون کی حفاظت کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اگر سورج کی روشنی میں نکلیں تو سن اسکرین لوشن کا استعمال ضرور کریں۔

آپ کے نظر آنے والے حصوں مثلاً جلد، ہاتھ، پاؤں وغیرہ، صرف ان کو ہی موئسچرائزر کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ پورے جسم کو ہی ان کی ضرورت ہوتی ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ جلد کی اوپری تہہ ہمارے پورے جسم کی حفاظت کرتی ہے ایک صحت مند جسم کے لئے جلد کا صحت مند ہونا ضروری ہے۔

☆ نہانے یا شاور لینے کیلئے آپ نیم گرم پانی استعمال کریں نہانے یا شاور لینے کا دورانیہ مختصر رکھیں اور دن میں ایک ہی مرتبہ نہائیں۔

☆ نہاتے وقت صابن کا زیادہ استعمال نہ کریں بلکہ شاور جیل یا فیس واش استعمال کریں۔

☆ بہت زیادہ تیز پرفیوم والی چیزیں استعمال نہ کریں۔ اس میں شامل الکحل آپ کی جلد کو نقصان پہنچاتا ہے اپنی جلد کو تیزی سے ہرگز نہ مسلیں اور نہانے کے فوراً بعد موئسچرائزر کا استعمال کریں۔

☆ اپنے ہونٹوں، ہاتھوں اور پاؤں کا بھرپور خیال رکھیں کیونکہ یہ حصے کھلے رہتے ہیں۔ لپ بام کا استعمال کریں۔ ہاتھوں اور پیروں پر موئسچرائزنگ کریم دن میں دو مرتبہ ضرور لگائیں۔

☆ سن اسکرین کا استعمال کریں۔ موسم گرما کے ساتھ ساتھ موسم سرما میں بھی سن سکرین کا استعمال لازمی ہے۔

☆ نائٹ اور ڈے کریم کا استعمال کریں۔ بہت سی نائٹ کریموں میں آپ کی عمر کو چھپانے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے۔

☆ جلد کی حفاظت اور اس کی خوبصورتی کو برقرار رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ پانی زیادہ سے زیادہ پئیں۔

☆ اپنے گھٹنوں اور کہنیوں کا خاص خیال رکھیں ان کا مساج ضروری ہے کیونکہ یہ باقی جلد کی رنگت سے ڈارک ہو

جاتے ہیں۔

☆ اپنے چہرے کے ساتھ ساتھ اپنے جسم کا مساج بھی کریں۔اس سے مردہ جلد ختم ہو کر تازہ جلد آجاتی ہے۔ فیشل کے لئے چند ماہ بعد ضرور جائیں فیشل اپنی جلد کی مناسبت سے کرائیں۔آپ کے دماغ کو سکون ملے گا۔یاد رکھیں کہ صحت مند زندگی کے لئے جسم کا صحت مند ہونا ضروری ہے۔

شازیہ مشتاق

کچن کارنر

کولڈ کیک

اجزا: بسکٹ ایک ڈبہ، چینی 10 چمچ، کوکو پاؤڈر 2 چمچ، انڈے 2 عدد، مکھن 6 اونس، بادام 10 عدد

ترکیب: چینی، مکھن، کوکو پاؤڈر اور انڈے کو چولہے پر پکالیں جب کسٹرڈ کی طرح تیار ہو جائے تو ذرا ٹھنڈا ہونے دیں۔ بسکٹ کریم والے نہ ہوں کرنچی بسکٹ ہوں ہر بسکٹ کے 4 ٹکڑے کرلیں ۔ ان پر بادام کرش کر کے ڈال دیں دوسرے کسی پیالے میں بسکٹ بادام رکھیں اوپر سے کوکو کسٹرڈ ڈالیں اب ان کو کسی چمچ سے مکس کرلیں اب ایک فلیٹ شاپر لیں اس میں ڈال دیں یہ آمیزہ اور اس شاپر کو رول کی شکل میں لپیٹ کر فریزر میں جمنے کیلئے رکھ دیں 1 گھنٹے بعد اس کو ہاتھ لگا کر دیکھیں اگر یہ سخت ہو گیا ہے تو اسے نکال لیں ورنہ مزید کچھ دیر کیلئے فریزر میں چھوڑ دیں تاکہ اچھی طرح جم جائے اب شاپر کاٹ کر اس میں سے یہ رول نکال لیں اور اسے سلائس کی صورت میں چھری سے کاٹ لیں اور کسی پلیٹ میں سجائیں یہ بہت اچھا لُک دینگے اب کافی یا چائے کیساتھ سرو کریں چاہیں تو اسے کیک کے سانچے میں بھی کیک کی طرح جما سکتے ہیں لیجے کولڈ کیک تیار ہے۔

فروٹ کیک

اجزا: میدہ 125 گرام، انڈے 5 عدد، مکھن 100 گرام، گاجر کا مربہ 50 گرام ، بادام کی گریاں 25 گرام ، کشمش 25 گرام ، بیکنگ پاؤڈر 1 چمچ ، چینی 125 گرام ، ایسنس (خوشبو) چند قطرے۔

ترکیب: ایک برتن میں انڈے پھینٹ کر مکھن (چینی پیس لیں) چینی پسی ہوئی، بیکنگ پاؤڈر، کشمش، بادام اور پستہ کی گریاں کتر کر، مربہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ لیں خوشبو اور میدہ ڈال کر مکس کرلیں اور اس آمیزے کو 15 منٹ کیلئے چھوڑ دیں اب کاغذ پر گھی لگائیں اور سانچے کے چاروں طرف بھی گھی لگا کر درمیان میں آمیزہ ڈال دیں اور اوون میں 45 منٹ کیلئے بیک کرلیں۔

رچ ایلمنڈ کیک

اجزا: مکھن 3,4 کپ چینی 2 کپ، انڈے 6 عدد، کھویا 3,4 کپ، بادام (کٹے ہوئے) 1 کپ، ایسنس چند قطرے، ثابت بادام 8 عدد، میدہ 1 کپ۔

ترکیب: مکھن اور چینی کو اچھی طرح مکس کرلیں پھر ان میں انڈے ڈال کر خوب پھینٹیں یہاں تک کہ چینی اور انڈے یکجان ہو جائیں اب اس میں کھویا ملائیں اور ایسنس اور بادام کوٹ کر بھی شامل کریں اور ان سب چیزوں کو اچھی طرح مکس کرلیں اب تھوڑا تھوڑا میدہ شامل کر کے بیٹ کرلیں پھر سانچے میں کاغذ کو گھی سے چکنا کر کے بچھائیں اور اس میں

آمیزہ انڈیل دیں ساتھ ہی ثابت بادام بھی ڈال دیں اور ایک گھنٹے کیلئے رکھ دیں اب اوون کو 180 ڈگری پر سیٹ کریں اوراس میں کیک کا سانچہ رکھ دیں 30 سے 45 منٹ، اب چیک کریں اگر کیک پھول گیا ہے تو نکال لیں اب اس پر کیریم سے اپنی مرضی کی سجاوٹ کریں۔